اور سجاد ظہیر مرحوم کے بھوپال میں چند روزہ قیام کی دلچسپ روداد تحریر کی گئی ہے، یہ سب مضامین مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں، اور بعض مصنف کی مطبوعہ کتابوں میں بھی شامل ہیں، لیکن علاوہ مجموعہ کی اشاعت کی حیثیت قند مکرر کی ہے، غالباً کتابت کی غلطی سے ایک جگہ بلوغ المرام کو بلاغ المرام لکھ دیا گیا ہے۔

اقبالیات - مرتبہ جناب عبدالقوی دسنوی تقطیع متوسط

یہ کتاب بھی دسنوی صاحب نے لکھی ہے، یہ اقبال کے متعلق اب تک کی ہندوستانی مطبوعات مضامین، تحریروں اور یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کا اشاریہ ہے، اس کے ساتھ اقبال پر پاکستانی اہل قلم نے ہندوستانی رسالوں میں اور ہندوستانی اہل قلم نے پاکستانی رسالوں میں جو مضامین لکھے ہیں، ان کی فہرست بھی آگئی ہے، امید ہے کہ اس مختصر کتاب سے اقبال پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

احکام التعزیت - اس کتابچہ میں مسلمان کے آخری مراسم یعنی بیماری ہونے میت کے غسل، تجہیز و تکفین، نماز جنازہ، قبر اور ایصال ثواب وغیرہ کے شرعی احکام بیان کئے گئے ہیں، اس کے مصنف مولوی حاجی عین الحق اعظمی دینی و ملی خدمت کا ولولہ رکھتے ہیں، اور اللہ نے ان کو فراغت بھی عطا کی ہے، یہ رسالہ مصنف کو نیو انٹ ٹیزی جاج مئو کانپور کے پتہ پر خط لکھ کر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے، مگر عربی عبارتوں میں اعراب کی غلطیاں بہت ہیں، "ض"

تعمیر حیات - مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کی نگرانی و سرپرستی میں مہینہ میں دو بار نکلتا ہے، قیمت - سالانہ بارہ روپیے

پتہ پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوہ لکھنو

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۸ء عدد ۳

مضامین

شذرات

پاکستان کے سفر میں جو علمی تحائف ملے اُن میں سب سے قیمتی اور کارآمد دائرۂ معارفِ اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) کی پندرہ خوبصورت اور دیدہ زیب جلدیں ہیں جو ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر عبدالقیوم اور خاص طور پر جناب شیخ نذیر حسین کے لطف و کرم کی بدولت حاصل ہوئیں، اب یہاں یہ اربابِ ذوق کے لئے مرکزِ توجہ بنی ہوئی ہیں،

معلوم ہوا کہ اس کی بارہ جلدیں اور شائع ہوں گی، یہ سلسلہ مکمل ہو گیا تو نہ صرف اردو زبان کے شیدائیوں کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی، بلکہ اس زبان کے وزن اور وقار میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا کہ "اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہم علوم و فنون کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی زبان میں فراہم کر لیں جو علمی، ادبی، قومی، تجارتی، اخلاقی ہر قسم کے علوم و خیالات کی ادا اور تعبیر کی کفالت کر سکے، ایسا مجموعہ جو ان گوناگوں علوم و خیالات کا کفیل ہو، ایک اردو دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کے سوا کچھ اور نہیں" ان کی یہ آرزو ان کی زندگی میں پوری نہیں ہوئی، ان ہی کی طرح اور دوسرے اربابِ علم کی طرف سے بھی ایک قاموس اسلام کیلئے برابر آواز اٹھی، مگر یہ دب کر رہ گئی، یہ شیر دلانِ پنجاب کیلئے مقدر تھا کہ وہ اردو بولنے والوں کی آرزوؤں کے ایک صحرا کو لالہ زار اور مرغزار بنا دیں

قصۂ شیریں عجب افسانہ ایست   کوہ کن خواب اندر ایں افسانہ کرد

دائرۂ معارفِ اسلامیہ کی ابتدا پروفیسر محمد شفیع مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی، انھوں نے اپنے علم کی گہرائی اور نظر کی وسعت سے اس عظیم علمی کام کا جو معیار قائم کیا تھا، وہ ان کی وفات کے بعد برقرار رہا، اس وقت اس کے ادارۂ تحریر کے رئیس اس برصغیر کے مشہور مصنف اور محقق ڈاکٹر سید عبداللہ ہیں جن کی خوش انتظامی،

خوش سلیقگی اور تحقیقی دیدہ وری سے اس کی مختلف جلدیں بڑی خوش اسلوبی سے تیار ہو رہی ہیں اُن کے رفقائے کار پروفیسر سید محمد امجد الطاف، پروفیسر عبدالمنان عمر، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی اور شیخ نذیر حسین صاحبان ہیں، جو اپنی پوری علمی بصیرت کے ساتھ ان کی امداد کر رہے ہیں،

استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تدوین کی تحریک کی تھی تو ان کا خیال تھا کہ اُس کی تالیف، طبع اور اشاعت کے لئے ایک شاہی خزانہ شہنشاہانہ عزم اور حوصلہ مندیوں کی ضرورت ہوگی اس شہنشاہانہ عزم اور حوصلہ مندیوں کی تکمیل پنجاب یونیورسٹی لاہور کے خزانہ سے ہو رہی ہے، اس کی بنیاد تو انگریزی میں لکھی ہوئی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ہی پر ہے، مگر انگریزی اڈیشن کے لکھنے والوں نے اکابر اسلام اسلامی علوم و فنون، اسلامی نظر و فکر سے متعلق جو زہر پھیلانے کی کوشش کی تھی، اس کا تریاق اس اردو اڈیشن میں موجود ہے، جن مشاہیر اور عنوانات پر انگریزی اڈیشن میں مقالات نہیں تھے ان پر اچھے اور پُر از معلومات مضامین لکھوا کر ان میں اضافہ کر دیا گیا ہے،

ان پندرہ جلدوں میں صرف ف تک کے مقالات شامل ہیں یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ ان مقالات میں تحقیقات، تعبیرات، واقعات اور سنین کے اندراجات میں تسامحات نہ ہوں گی، کچھ نہ کچھ کا ہونا تو ناگزیر ہے، دارالمصنفین سے متعلق اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کو شوق سے یہاں پڑھا گیا، جلد نمبر ۳ کے ص ۲۷۹ پر اس کی مطبوعات گلِ رعنا اور شعر الہند کو مطبوعہ معارف پریس علی گڑھ بتایا گیا ہے، علی گڑھ کے بجائے اعظم گڑھ ہونا چاہئے تھا، جلد ۹ ص ۱۳۷ پر دارالمصنفین کی ایک کتاب دولتِ عثمانیہ کو عزیز مرزا کی تصنیف بتائی گئی ہے، حالانکہ اس کے مصنف کا نام محمد عزیر ہے، جلد ۹ ص ۱۳۶ پر لکھا گیا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کی پانچ جلدیں لکھیں، صحیح نہیں پہلی دوسری جلدیں مولانا شبلی کی ہیں، بقیہ چار جلدیں مولانا سید سلیمان ندوی کی لکھی ہوئی ہیں، اس قسم کی فروگذاشتیں دوسرے مضامین میں بھی ہو سکتی ہیں اُن سے قطع نظر ان میں ہر قسم کی جو معلومات فراہم کی گئی ہیں حوالے کے ساتھ ماخذوں کی جو فہرست دی گئی ہے، اطناب میں جو ایجاز دکھایا گیا ہے، جا بجا جو مفید تصویریں منسلک ہیں، مضامین کے قلمبند کرانے میں جس سلیقہ کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ہر طرح قابلِ مدح و ستائش ہے، ممکن ہے کہ ان کے مضامین میں زبان، اندازِ بیان، روزمرہ، محاورے، تذکیر و تانیث، اردو کے بجائے فارسی یا عربی جمع لکھنے وغیرہ کی کہیں کہیں خامیوں کی نشاندہی بھی کی جائے مگر مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے ہزاروں لاکھوں صفحات میں اس قسم کی خامیاں

زیادہ قابلِ التفات نہیں،

جب یہ عظیم الشان علمی کام پورا ہو جائیگا، تو اردو زبان صحنک سے اُٹھکر چلی جانے کی دھمکی دینے کے بجائے اپنی بڑی بوڑھیوں، اور ثقہ بہنوں سے آنکھیں اچھی طرح ملا سکے گی، اب تک جتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان کی ظاہری شکلیں بھی دیدہ زیب ہیں جن سے ہر کتب خانہ کی زینت میں اضافہ ہو سکتا ہے، اُن کی پشت پر ان حروف تہجی کے بھی لکھدینے کا اہتمام ہونا چاہئے جن کے مضامین جلد کے اندر ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون سی جلد میں کن کن حروف کے مضامین ملیں گے، ان کی فروخت کا انتظام ہندستان میں بھی ہونا چاہیئے تاکہ یہاں بھی اس خزینۂ علم کا باب کھل سکے، اور یارانِ نکتہ داں کے لئے یہ صلائے عام بن کر رہیں،

دار المصنفین کی مجلسِ انتظامیہ کا جلسہ ۵ / ۶ / مارچ ۱۹۷۶ء کو مولانا ابو الحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا، اس میں اس کے اکابر اراکین شریک ہوئے، اُن کی تشریف آوری سے یہاں تین روز بڑی چہل پہل رہی بہت سی مفید تجویزیں منظور ہوئیں، جن سے امید ہے کہ اس کی ترقی اور سربلندی کیلئے مزید راہیں نکل آئیں گی، ایک روز اسکی مسجد کے اندر ایک دینی اجتماع بھی ہوا جس میں مولانا عمران خاں ندوی کی بہت ہی دلچسپ پرکیف اور رقت آمیز تقریر ہوئی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قدیم طلبہ کے حلقہ میں جناب عبید الرحمان خان شروانی صاحب کی بڑی پذیرائی ہوئی انکے ایک اجتماع میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے مسائل سے اُن کو مطلع کیا،

اسی زمانہ میں شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں اقبال پر ایک سمینار رہا، اس میں جناب عبید الرحمٰن خاں شروانی صاحب کی صدارت میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کی ایک تقریر اس پر ہوئی، کہ اقبال شاعر تھے، اقبال شاعر نہ تھے، اقبال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شیفتگی اور وارفتگی تھی، اس کو مولانا محترم نے کچھ اس دلنشیں انداز میں پیش کیا کہ پورے مجمع پر بڑی کیفیت طاری ہو گئی، آخر میں انھوں نے فرمایا کہ اقبال کے اشعار سے دلچسپی لینا، مگر ان کے پیامات پر عمل نہ کرنا اپنی بے حسی اور زبون حالی کی دلیل ہے، اس موقع پر جناب محمد نسیم قریشی استاد شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی بھی مدعو تھے، انھوں نے اپنے خطیبانہ انداز میں اقبال پر جو تقریر کی، اس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے،

مقالات

سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کا ایک باب

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

"۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ (۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ

"عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا ہے جو کچھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اس سفر میں گذر جائے اور آخر میں خوش نصیب سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے

منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ماہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول کی، پانچویں کے بعد چھٹی جلد تیار کی، اور ساتویں کی تالیف میں مصروف تھے، کہ بارگاہِ الٰہی میں حاضری کا حکم آ گیا، اُن کی بیگم صاحبہ نے ازراہِ کرم اس کا مسودہ دار المصنفین کو عنایت کر دیا ہے، ذیل کی سطور میں ہم اس کا ایک باب شائع کر رہے ہیں، اسی کے ساتھ سید صاحب کا وہ دیباچہ بھی شامل کر رہے ہیں، جس میں انھوں نے ساتویں جلد کے موضوع کی اہمیت اور مشکلات بیان کی ہیں، تاکہ

ناظرین کو اندازہ ہو سکے کہ یہ کام کتنا دشوار ہے اور ہمت طلب ہے۔" ص ع"

معاملات

سیرت کی ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے، ہماری اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت، مال و دولت اور حکومت کے ضابطے اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے، کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق اُن تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زیادہ افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو، اور اُن کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو۔ ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں، معاشرتیات، اقتصادیات اور سیاسیات، اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اور انھیں تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے۔ معاشریات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہو گی، اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا، اور سیاسیات میں حکومت اور سلطنت اور اس کے متعلقات مذکور رہوں گے۔

اس کام کا اشکال یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے، جن میں یہ احکام مذکور ہیں، اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانہ میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال کو تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو

سامنے رکھ کر سونچا جائے (ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہ سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے) اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدیم کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کرتے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔

(اشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا ماخذ خود ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس میں سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علحدہ کرنا ہے، یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچمدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گو ۸ رجمادی الثانیہ ۱۳۵ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دئے، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا، اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ رشعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے۔ مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔

رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَيَسِّرْ لِی اَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِی يَفْقَهُوا قَوْلِی۔

عہدِ نبوی میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت کے قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمامتر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت وحشت سے زیادہ یا کم از کم اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے نظام حکومت کا

دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ دیرپا تھی، چنانچہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد گو وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردن جھکا دی، لیکن تمدن کا سر پر غرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور طرز جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ جو ۹ھ میں پیش آئے، اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی کا نتیجہ ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی پوری سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کی زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے مختلف قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام تھا وہ انھی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں باذان نام ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور

نظام تمدن کی نقالی اور تصویر ہوتی تھی، اور ان سے الگ ان سے بالاتر کسی نظام زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم ضرورت یہ تھی کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی حکومت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نہ صرف عربوں کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانون الٰہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانون الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظام حکومت کو بھی بتدریج ترقی ہوئی۔ چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے آئے تھے، مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی عہداً بعد عہد اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

اور اسی طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لئے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے بروئے کار لائی گئی ہے (تفصیل دوسری جگہ ہے)

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور اسلام کی ۲۳ سالہ زندگی میں تقریباً سولہ سترہ سال انھیں قبائل کی اصلاح وہدایت کے نذر ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لئے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپؐ کو قبیلۂ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرۃ بنایا اور وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے زیادہ پرخطر تھا اور ابتدا میں صحابہ اور مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لئے اس کی آب وہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظام اسلام کی اشاعت ہو گئی اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی فتح مکہ کا راستہ صاف کر دیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آگیا، اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو اور بھی وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصے میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے قرب وجوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدم قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس کے جواب میں خود قیصر کا دل اگرچہ نور اسلام سے منور

ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاج مرصع اور تخت زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوۂ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لئے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

اَلْیَوْمَ اسْتَدَارَ الزَّمَانُ کَہَیْئَتِہٖ	زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آگیا جس پر
یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ	وہ اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان وزمین کو
وَالْاَرْضَ۔	پیدا کیا۔

یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا، جس نے تمام خودساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظام ہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ وقیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشینگوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی: اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ وَاِذَا ھَلَکَ قَیْصَرُ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَہٗ، اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص خدا کے بعد ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں

حق تھی، یا اس کو یوں کہیے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگران و حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ۔ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کی زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔ یہی مطلب ہے، اس سے اسلام کے اصول سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر، ہزاروں گھروں کو ویران کر کے، سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے۔ مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظام سلطنت کے جدوجہد میں اس میں سے کوئی چیز مطمح نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمان الٰہی کے آگے سارے بندگان الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا کی تاریخوں میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیام سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جس میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا

مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرماں روا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرز سلطنت، طریق حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو۔

اسی مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانہ ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی، اور معنویت یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ نظری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ان ہی میں ازل سے ودیعت رکھی گئی تھی۔ عرب کی نظری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ عربوں کے یہ اخلاقی عناصر، حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں اور ان اوصاف کی جلا، اخلاص، للّٰہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاق روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لیے اولاً ان کو اس طرح حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار اور شاہانہ ہیبت کی فرضی شکل و صورت کے لیے قائم کر رکھا تھا، ان اخلاقی محاسن کا وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو و نما کی صورت ایک ہی تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ مامور من اللہ، ایک پاکباز رہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتو صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکام الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی

اور احترام پر خود مجبور کردے۔

اس اصول پر جو نظام سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں:

(۱) یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو (۲) یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساس اولین محض اخلاص قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظام سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا، اس نظام سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی سب ایک ہی سطح پر آکر کھڑے ہوگئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو شرق و مغرب میں بچھے تھے الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہل کار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کردئے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی وہ عرب کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی، کیونکہ اہل عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کئے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا، ان میں سرداران قبائل کے لئے خاص ذاتی حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں

جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فقول کہتے ہیں اور اسلام نے انھیں کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے عام مجالس میں لوگوں کو سرداران قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا کہتا ہے:

ونکران شئنا علی الناس قولھم | ولا ینکرون القول حین نقول

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کردیں | اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کرسکتے

سرداران قبائل اپنے لئے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے ان میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:

لا حمی الا حمی اللہ ورسولہ | اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اس رسم کا مٹانا تھا، سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہوکر اونچے اونچے بیش بہا تخت پر جلوس کرتے تھے۔ ان کے امراء علیٰ قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، سونے چاندی کی نشست کے سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کئے گئے، سونا چاندی کے زیورات مردوں کے لئے ناجائز ٹھہرے۔ امام وقت اور اس کے حکام کے لئے مسجد اور اس کی کھلی جگہ ایوان تھی، حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش و نقیب رخصت کردئے گئے، طلائی و نقرئی و زمردیں تخت اٹھوا دئے گئے۔ امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ بالکل ایک سی حالت میں نشست کرتے تھے اور پستی و بلندی کی تفریق باقی

نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع ولباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک صحابی ایک شاہی عبا لیکر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے لوگ آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمائیں، یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار کا دن ہے آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ وجلال پر گئی، جو شاہان وقت میں رائج تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ وجلال کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح صورت نشست میں آپ نے تفوق کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عامی آدمی میں اس خاص حیثیت سے کوئی فرق نہیں رہتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمدؐ کون ہیں، لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے، مگر اس کو بھی پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہانہ افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے، ایک بار مخزومی عورت فاطمہ بنت قیس نے چوری کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ کو یہ سخت گراں گذرا،

اور لوگوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی، آپنے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی ہوتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا [1]

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کونچ دیا، جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا۔ [2]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ میں چکی پیسے پیسے چھالے پڑ گئے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے، لیکن آپ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں [3] ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا، اسلامی محاصل زکوٰۃ وصدقات وعشر ومحاصل کے وجوب اور ادا میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں اور یہاں حضورؐ نے اپنے لئے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ

---

[1] یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراہۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان [2] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸ کتاب الحدود [3] ابوداؤد

آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اور عبدیت کاملہ ہی آپ کا کمال ٹھہرا، اعزاز کے وہ رسمی طریقے جن کا
سلاطین نے اپنے کو زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے
برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کہے، ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کیلئے ہے
ان موقعوں پر یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیاء پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیم کا انتقال ہوچکا تھا،
اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوجاتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے،
اس لئے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپ صلوٰۃ کسوف سے
فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو
نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا[1]

ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر
رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا
ہوں، جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا
ہوں، محمد کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ حق کس کا تھا،[2] حالانکہ
یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں میں پھانسی تک دی جاسکتی تھی کہ اس سے
ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی تھی۔

ایک بار آپ نماز پڑھا رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: "خداوندا! مجھ پر
اور محمد پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر" آپ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی

۱؎ بخاری باب الکسوف ۔ ۲؎ مسند ج ۳ ص ۴۲۵ مسند اسود بن السریع

بدو کو ٹوکا کہ "تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا"[1] حالانکہ شاہانہ محاورہ میں شاہانہ
وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس نے اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطین زمانہ
اکرام وانعام کی بارش کر سکتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات ومحاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور
اپنے ذاتی وخانگی عیش وآرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف نہ تھا، اور اگر وہ اس میں سے
دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے، لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا
اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور صرف بیت المال
کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لئے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا،
وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن
آپ نے اس کو اپنا نہیں بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو
اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے
خاندان ہاشم پر حرام فرمادی اور اس کو بحکم الٰہی عام غرباء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا،
اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے: قال ما اوتیکم من شیئ وما امنعکم ان
انا الا خازن اضع حیث ما امرت،[2] میں تم کو نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ روک سکتا، میں صرف
خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں، دوسرے
موقع پر فرمایا: انما انا قاسم واللہ یعطی، میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو خدا ہے،
غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر
تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے اختیار کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور اپنے اہل بیت کے

۱؎ بخاری ج ۲ ص ۸۸۹، کتاب الادب ۔ ۲؎ ابوداؤد، جلد ۲، ص ۱۵، کتاب الخراج والامارۃ ۔

علاوہ اور جن نادار و محتاج مسلمانوں کو جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، دیا کرتے تھے، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا حضورؐ اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اس کی آمدنی بھی اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرمادیا کرتے تھے، اور صاف اعلان فرما دیا تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوں گے۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ وجلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لئے ظاہری شاہانہ تزک واحتشام بھی ضروری ہے، چنانچہ انھیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سادگی تواضع اور زہد وقناعت کے بجائے کاش اسی عیش وآرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں، اور یہ آپ کا خزانہ ہے جہاں جو سرمایہ ہے وہ میرے

سامنے ہے، ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور حضور اللہ کے رسول ہیں، ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں، اور وہ دنیا، حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں بے شک یا رسول اللہ۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ دعا فرمائیے کہ خدا آپ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے، تاہم خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دئے ہیں، آپ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو، رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دئے گئے ہیں"[1]۔

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تزک واحتشام اور عیش وآرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع ہی پہن کر اور جھونپڑے[2] میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انھوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپؐ نے فرمایا، ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں[3]، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گذرو گے تو تم سجدہ کرنے، عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہئے[4] ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا، آپ نے حیرت سے فرمایا: معاذ

[1] بخاری و مسلم کتاب النکاح، باب الایلاء [2] یعنی پیوند دار (معارف) [3] و [4] ابوداؤد، کتاب النکاح

یہ کیا؟ عرض کی یا رسول اللہ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیوی کو کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1]۔

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہ اور پیشوا کو قرب وجوار کے سلاطین کی طرح عیش وآرام اور تزک واحتشام کے مناظر میں دیکھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف وتبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت ورونق سراب کی نمایش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں،

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کامل نمونہ سے اس کو کر کے دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی کی پیروی کی اور یہی سادگی وتواضع اسلام کا کارنامہ قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا وبخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے موروثی استحقاق اور سعی سفارش کی بنا پر ہوتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولتمندوں کی دولتمندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الٰہی کے تحت جو نظام اسلامی قائم فرمایا اس میں دولتمندی اور تقرب نہیں بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ نگینے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے

[1] ابن ماجہ کتاب النکاح۔

تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا[1]۔

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات وتصنعات اور اظہار غلامی وعبودیت کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آسکتا تھا، اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت کی عقیدت مندی اگرچہ صحابہ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمدؐ کہہ کر خطاب کرتا اور حضورؐ خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے تھے، اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کر دیتا تھا، آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب انھیں یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو اس کی نسبت بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتے تھے اور حضورؐ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اپنے خلاف بھی رائے ہوتی تو قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے، اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں سفارش ہے، عرض کی: "تو قبول سے معذور ہوں[2]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

[1] دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الخراج میں ہیں [2] صحیح بخاری باب تکون الحرۃ تحت العبد وباب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرہؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے اور اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض
ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا یا اپنی رائے سے؟
فرمایا: رائے سے۔ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ موقع مناسب نہیں ہے،
بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا۔ اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ انتم اعلم
بامور دنیاکم، تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو،
اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ
نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا
کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لئے کرتے ہوں گے، اس لئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ
انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
ادھر گذر ہوا تو دریافت فرمایا، انھوں نے حالت عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے
یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان امور میں جن کا علم وحی سے ہے میری
اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر
ہی ہوں[1]

یہ حدیث ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کی تجربی باتوں سے ہے، بڑی اہمیت
رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت خداوندی
پر مبنی ہوتا جس کی اطلاع حضور کو بذریعہ وحی ہوتی، ان میں پھر کسی کا مشورہ بھی توجہ کے قابل نہیں
ہوسکتا تھا، کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا جس میں بندہ کو دخل نہیں۔

[1] صحیح مسلم، باب الفضائل۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت
عمر رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لئے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہو گئے
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟
آپ نے فرمایا: بے شبہہ ہوں، انھوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟
ارشاد ہوا کہ بے شبہہ ہیں، انھوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبے ہیں؟
آپ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا،
انھوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانۂ کعبہ کا طواف کریں گے؟
آپ نے فرمایا: ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انھوں نے کہا نہیں،
آپ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے لیکن ان کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین
نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انھوں نے بھی
وہی جواب دئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دئے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت
ان کی سمجھ میں آگئی تو انھوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے
کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا[1] اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے
کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض معروض کی مگر حضورؐ نے اپنے فیصلہ کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ
ارادت ربانی سے کیا گیا تھا، اسی طرح اسی موقع پر واقعۂ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے
ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا تو چونکہ
ان کے شدت ذوق و شوق زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لئے حزن و ملال
کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضورؐ

[1] بخاری جلد اول ص ۳۸۰، کتاب الشروط۔

یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے، لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گذرا اور مغموم ہو کر ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ ام المؤمنینؓ نے چہرۂ پاک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا، آپ نے واقعہ بیان فرما دیا، حضرت ام المومنین نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی کو کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس کے دقیق علم پر مبنی تھا، جس کا تعلق امورِ تجربیہ سے تھا، اس لئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا[1]۔

بعض ایسے واقعات بھی ہیں جن میں لوگ اپنی کم فہمی، نا عاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے ان پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری میں آب پاشی کے متعلق نزاع ہوئی

[1] اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہہ نہ کرے کہ کیا علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حضرت ام سلمہ کو معلوم تھا، تو جواب یہ ہے کہ جس طرح شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں جن سے کبھی انکو اس لئے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل کے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں، اسلئے ادھر توجہ انھوں نے نہیں کی اور شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کے علم میں خود اسی استاد کے فیض سے حاصل ہوئی تھی۔

صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، وہ انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو لینے نہ دیں، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا، قانون اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لیجائے لیکن آپ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ پہلے تم آب پاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ اخلاق کا ایک منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، تب آپ نے اخلاق کے بجائے قانون کا فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آب پاشی کر کے پانی کو روک لو، یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہونچ جائے[1]، یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسروں کے کھیتوں میں چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ انصاف فرمائیے، آپ نے فرمایا: اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اگر آپ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ نے ان کو روک دیا[2] اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے (یہ

[1] ابوداؤد، کتاب الاقضیہ جلد ۲ ص ۷۶، [2] بخاری جلد اول ص ۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام

پیشینگوئی امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہونچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ [وسلم] اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل [میں] بعد آنے والے خلفاء اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی [پیروی] میں ذاتی جاہ و اعزاز کے غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

سلسلہ سیرۃ النبی

جو معاملات پر تھی، زیر تحریر تھی، اور اس کے کچھ ابواب لکھے جا چکے تھے کہ سید صاحب مرحوم کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ، اور اس کی حسرت وہ اپنے ساتھ لے گئے، بقیہ چھ جلدیں جو ولادت، اور آپ کے اخلاق و شمائل، معجزات، منصب نبوت اور تعلیمات عبادات [...] تھیں، وہ یہ ہیں:۔

سیرۃ النبی کا سٹ

حصہ	ضخامت	صفحے	قیمت
حصہ اول	ضخامت ۴۴۶	صفحے	قیمت ۰-۲۰
" دوم	" ۴۴۶	"	۰-۱۴
" سوم	" ۸۸۸	"	۰-۲۸
" چہارم	" ۹۰۶	"	۰-۲۸
" پنجم	" ۵۱۵	"	۰-۱۵
" ششم	" ۸۸۲	"	۰-۲۸

"منیجر"

رصدگاہ محمد شاہی

یا

جنتر منتر

جناب شبیر احمد خان غوری ایم۔اے۔ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی فارسی اتر پردیش

(۳)

رصدگاہ کے کارکن نیڈھم کا یہ خیال کہ رصدگاہ دہلی کی ارصادی سرگرمیاں، اجے سنگھ نے محض ہندو کارکنوں کی اعانت سے انجام دی تھیں،[1] محل نظر ہے،

اس سلسلہ میں دو تین باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ اس وقت نہ صرف دار السلطنت دہلی، بلکہ اسلامی ہند کے قصبات تک میں مسلمان علماء کی ایک کثیر تعداد موجود تھی، جو منقولات (علوم دینیہ و ادبیہ) کے علاوہ معقولات میں بھی بشمول ریاضی و ہیئت کے ید طولی رکھتے تھے[2]، دہلی میں احمد معمار کا خاندان تھا، جو معماری کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولی رکھتا تھا، ان میں سب سے بزرگ لطف اللہ تھے، جو سول انجینیرنگ میں اپنے تبحر اور ہندسہ و ہیئت سے غیر معمولی شغف کی بنا پر "لطف اللہ مہندس" کہلاتے تھے، اور جنھوں نے شیخ بہاء الدین عاملی کے خلاصۃ الحساب کی ایک مبسوط شرح کے علاوہ فنون ریاضیہ میں اور کئی کتابیں

۱؎ نیڈھم کی پوری عبارت اور اس کا ترجمہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو معارف فروری ۱۹۷۶ء رصدگاہ محمد شاہی دہلی ص ۱۰۹) ۲؎ ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر الجزء السادس

لکھی تھیں، دوسرے فخرِ خاندان، امام الدین تھے، جو ریاضی میں اپنی دستگاہ عالی کی بنا پر "ریاضی" تخلص کرتے تھے، وہ مختلف علوم اسلامیہ میں کوئی بائیس کتابوں کے مصنف تھے، جن میں کئی کتابیں فنون ریاضیہ پر تھیں، ان میں سب سے مشہور "تصریح" ہے جو شیخ بہاء الدین عاملی کے ہیئتی متن "تشریح الافلاک" کی شرح ہے، امام الدین ریاضی سے پہلے خلخالی نے ایران میں اور مولانا عصمت اللہ سہارنپوری نے ہندوستان میں اس کتاب کی شرح لکھی تھیں مگر قبول عام امام الدین ریاضی کی "التصریح" ہی کو نصیب ہوا جو آج کے دن تک مدارس عربیہ میں ہیئت کے نصاب میں داخل ہے، یہی نہیں امام الدین ریاضی رصدگاہ کی تعمیر اور اس کے انتظام میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے شرح چغمنی کچھ حاشیہ لکھا تھا، اس میں رصدگاہ کی تعمیر و انتظام کی تفصیلی کیفیت قلمبند کی تھی، جس کا انھوں نے "التصریح" میں حوالہ دیا ہے، فرماتے ہیں:

"والرصد ..... سمی به الموضع الذی یرصدون فیه .... وان اوضحت بیان کیفیة عمله فی حاشیتی علی شرح العلامة الرومی للملخص الجغمینی علی وجه التمام والکمال"[1]

رصدگاہ کا نام رصدگاہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں ہیئت دان ارصاد کا کام کرتے ہیں، یعنی مختلف ستاروں کو مختلف دوائر کے قطع کرنے یا متعین نقاط پر پہونچنے کا انتظار کرتے ہیں، میں نے اعمال رصدیہ کے طریق کار اور کیفیت کو پوری وضاحت کے ساتھ اپنے اس حاشیہ میں بیان کیا ہے جو میں نے شرح جغمنی پر لکھا ہے،

---

۱ التصریح ص ۲۳، ۲۴

مولانا امام الدین ریاضی نے ۱۱۴۵ھ میں وفات پائی، بالفاظ دیگر وہ راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہ کے قیام اور اس کی ارصادی سرگرمیوں کے زمانہ میں بقید حیات تھے، اگرچہ بہت بوڑھے ہو چکے ہوں گے، کیونکہ انھوں نے ۱۱۰۳ھ میں التصریح کو تصنیف کیا تھا[1]، لیکن اگر انھوں نے کاروبار رصد میں کوئی عملی حصہ نہ بھی لیا ہو تو کم از کم فنی اور ٹیکنیکی مشورے تو دے ہی سکتے ہوں گے،

اس خاندان کے تیسرے رکن رکین مرزا خیر اللہ دہلوی تھے، ریاضی و ہیئت میں ان کی حذاقت و مہارت کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر فرماتے ہیں:

"الفاضل الکبیر العلامة خیر اللہ بن لطف اللہ المهندس الدهلوی احد العلماء المبرزین فی الفنون الریاضیة"[2]

فاضل کبیر علامہ خیر اللہ بن لطف اللہ مہندس دہلوی، ریاضیاتی علوم کے علمائے متبحرین میں سے ایک تھے،

مرزا خیر اللہ کو ان علوم کے ساتھ اس درجہ شغف تھا کہ ان فنون کی کتابیں اپنے مطالعہ کے لیے انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں، ان میں سے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "المجسطی" رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے (فہرست قدیم، فن ہیئت نمبر ۱)، انھوں نے ان فنون میں بہت سی کتابیں تصنیف کی تھیں[3]، جن میں سب سے اہم ہمارے پیش نظر موضوع کے نقطہ نظر سے راجہ جے سنگھ کی مرتب کردہ "زیج محمد شاہی" کی شرح ہے [اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اس رصدگاہ کی سرگرمیوں میں شریک تھے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے] خاندان مہندسی کے ارکان کے علاوہ اٹھارویں صدی کی دہلی میں اسلامی ہیئت کے

---

۳ انھوں نے تقریب التحریر کے نام سے "تحریر المجسطی" کی ایک مبسوط شرح بھی لکھی تھی،

۱ التصریح ...
۲ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۸۱

اور بھی ماہرین تھے، جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

ظاہر ہے تنگ نظر سے تنگ نظر متعصب بھی ایسے افاضل عہد و عباقرۂ روزگار کے اشتراک و علمی تعاون سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

۲- یہ تو فطری امر ہے کہ غیر مذہب والوں کے مقابلے میں اپنے ہم مذہبوں کی طرف راجہ کا میلان خاطر زیادہ تھا، چنانچہ اس نے جوتش کے ایک ماہر کو بہت بڑی جاگیر دی تھی، جو بعد میں اس کے خاندان میں رہی اور ولیم ہنٹر صاحب جنھوں نے سب سے پہلے راجہ جے سنگھ کی ان ہیئتی مساعی کو یورپ میں متعارف کرایا، اُس جوتشی کے پوتے سے ملے بھی تھے[1] اور اس طرح اس رصدگاہ کے ہندو کارکنوں کو شہرت مل گئی جس سے مسلمان ہیئت دان محروم رہے، کیونکہ ہندو جوتشیوں کے خاندان کو تو ولیم ہنٹر صاحب نے ڈھونڈھ نکالا لیکن ہنٹر صاحب کو اہل اسلام کے ساتھ جو دلچسپی تھی وہ تاریخ کا ناقابل تردید علوم متعارفہ ہے، لہذا اگر ہم اُن سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اس رصدگاہ کے مسلمان کارکنون کے سلسلے میں بھی ایسی ہی زحمت فرمائیں گے تو یہ تکلیف مالایطاق کا مصداق ہوگی۔

بہر حال ایک بات امر واقعہ ہے کہ بادشاہ وقت نے سوائی راجہ جے سنگھ کو حکم دیا تھا کہ وہ اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے فرقۂ اسلام کے ہندسین و منجمین کو نیز جوتش کے ماہر پنڈتوں اور یورپی ہیئت کے واقف کار فرنگیوں کو جمع کرلے اور ان سب معاونین کی مدد سے کار و بار رصد کو ختم کر کے نئی زیج مرتب کرلے، خود راجہ لکھتا ہے۔

"فرمودند کہ ..... ہندسان و منجمان فرقۂ اسلام و برہمنان و دانایان فرنگ جمع نمودہ و آلات رصدی ساختہ ..... سعی نماید[2]"

[1] Tod, Rajasthan, Vol II P 290 Foot note [2] زیج محمد شاہی ورق ۲ ف

بفرض محال راجہ متعصب و تنگ نظر بھی تھا، تو کیا وہ اس حکم سلطانی کی بجاآوری میں کوئی تغافل و تساہل برت سکتا تھا؟

۳- ان قرائن سے قطع نظر تاریخ نے اس رصدگاہ کے دو مسلمان کارکنوں کا ذکر محفوظ رکھا ہے، ان کے نام ہیں، مرزا خیر اللہ اور مولانا محمد عابد دہلوی۔

چنانچہ صاحب "سیر المتاخرین" نے مصرحہ طور پر لکھا ہے کہ ہرچند یہ رصدگاہ راجہ جے سنگھ کچھواہہ کی کوشش کے نتیجہ میں تعمیر ہوئی تھی، مگر اس کی رصادی سرگرمیاں ان دونوں فاضلوں (مرزا خیر اللہ اور مولانا محمد عابد) کے زیر اہتمام انجام پائی تھیں، وہ رجب ۱۱۵۵ھ (مطابق سن بست و پنجم جلوس محمد شاہی) کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"دریں ماہ و سال قران علویین در آخر برج اسد موافق زیج جدید کہ بسعی راجہ جے سنگھ کچھواہہ باہتمام مرزا خیر اللہ و شیخ محمد عابد ہندسی در عہد محمد شاہ پیرایہ آغاز و انجام یافتہ، در اول سنبلہ موافق زیج الغ بیگی واقع شدہ[1]"

ان فاضلوں کا تفصیلی تذکرہ مولانا عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلما نے نزہۃ الخواطر میں قلمبند ہے۔

اول الذکر کے بارے میں صاحب "نزہۃ الخواطر" فرماتے ہیں۔

مرزا خیر اللہ الدہلوی: الفاضل الکبیر العلامۃ خیر اللہ بن لطف اللہ المہندس الدہلوی، احد العلماء	مرزا خیر اللہ دہلوی، فاضل کبیر علامہ خیر اللہ بن لطف اللہ المہندس دہلوی، فنون ریاضیات کے علمائے مبرزین میں سے تھے

[1] سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور جلد سوم صفحہ ۴۸۹ ذکر سوانح سال پنجاہ و پنجم از مائۃ دوازدہم ہجری نبوی کہ سال بست و پنجم جلوس محمد شاہی است۔

المبرزين فى الفنون الرياضية
تولى المرصد بمدينة دهلى لسنة
احدى وثلاثين ومائة والف
فى ايام محمد شاه الدهلوى وصنف
التصانيف النافعة فى الزيج و
التقويم منها شرح زيج المحمدشاهى
قد ابدع فيه واجاد وخالف
القدماء فى بعض المسائل۔ [1]
(نزهة الخواطر ۔ ۶ ۔ ۸۱)

بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۳۱ھ میں
شہر دہلی کے اندر رصد گاہ میں مقرر ہوئے،
انھوں نے زیج اور تقویم کے موضوع پر بڑی
مفید تصانیف مرتب فرمائیں، انھیں میں
سے شرح زیج محمد شاہی ہے، انھوں نے
اس میں بہت سی نئی تحقیقات لکھی ہیں اور
اسے بڑے اچھے طریق پر تصنیف کیا ہے،
اس کتاب کے اندر بعض اہم مسائل
میں قدیم ہیئت دانوں سے اختلاف کیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے ان منفردات میں سے ایک مسئلہ کا ذکر کیا ہے کہ قدیم ہیئت دانوں کا خیال تھا کہ آفتاب اور اسی طرح دوسرے سیارات کے مدار مدور ہیں، مگر مرزا خیر اللہ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ نہیں یہ مدار "بیضی" (Elliptical) ہیں، کیونکہ انھیں دائرہ مانکر جب سیارات کی تقویم کا حساب لگایا جاتا ہے، تو وہ "مرصود" (مشاہدات) کے مطابق نہیں آتا، لیکن اگر ان مدارات کو بیضی مانیں تو محسوب اور مرصود ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں، اسکی تفصیل "جامع بہادر خانی" کے حوالے سے اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ [2]

دوسرے فاضل مولانا محمد عابد دہلوی کے بارے میں صاحب نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں:

۶۱۱۔ مولانا محمد عابد الدهلوى. الشيخ
الفاضل محمد عابد المهندس الدهلوى

۶۱۱۔ مولانا محمد عابد دہلوی، فاضل شیخ محمد عابد
دہلوی جو (بہت بڑے) ہندسہ تھے وہ

۱ نزہتہ الخواطر ۔ الجزء السادس ص ۱۸ ۲ جامع بہادر خانی ص ۵۰۹

احد العلماء المبرزين فى العلوم
الحكمية ـ ولاه محمد شاه على الرصد
الذى بناه بدهلى ـ وله مصنفات
عديدة ـ منها رسالة فى استخراج
اوساط العلوية فى فن الهيئة [1]

علوم حکمیہ کے مشہور باکمال علماء میں سے
ایک تھے، بادشاہ محمد شاہ نے انھیں اُس
رصد گاہ میں مقرر کیا تھا، جسے اُس نے دہلی
میں بنایا تھا، انھوں نے بہت سی تصانیف
چھوڑی ہیں، ان میں سے ایک ان کا رسالہ
"فی استخراج اوساط العلویہ" ہے جو فن ہیئت میں ہے۔

ان معلومات کے بعد جوزف نیڈھم کے اس قول پر کہ

"راجہ جے سنگھ ہندو تھا جس نے ہندو رفقائے کار کی مدد سے رصد گاہ کا کام انجام دیا۔"

کسی مزید تبصرہ کی حاجت نہیں رہتی۔

تعمیر رصد گاہ کے مصارف الغ بیگ کی رصد گاہ کی جودت ونفاست کا ایک سبب یہ تھا کہ اُس نے اس پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا تھا، بالخصوص آلات رصدیہ کی تیاری میں، [2] اور رصد گاہ دہلی کی عظمت بھی بادشاہ محمد شاہ کی فیاضی وفراخ دلی کی رہین منت ہے، اس رصد گاہ پر تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا، جو اس زمانہ کے لرزاں معاشی حالات کو دیکھتے ہوئے غیر معمولی طور پر کثیر رقم ہے، چنانچہ صاحب "نزہتہ الخواطر" بادشاہ محمد شاہ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"ومن مآثره انه جمع علماء عصره
من اقطار مملكته وامرهم بان
يضعوا الآلات الرصدية و

بادشاہ محمد شاہ کے مآثر میں سے ایک یہ
واقعہ ہے کہ اُس نے اپنے زمانہ کے علماء
کو مملکت کے مختلف حصوں سے طلب کرکے

۱ نزہتہ الخواطر ۔ الجزء السادس ص ۳۲۲ ۲ گستاؤلی بان ۔ تمدن عرب ص ۴۲۲

ان يقيسوا بها الكواكب ويتعرفوا احوالها ففعلوا ذلك وتولى الرصد بمدينة دهلي وجے پور وبنارس تحت نظارة جے سنگھ صاحب جيپور. وبذل على ذلك محمد شاه ثلاثين مائة الف (ثلاثة ملايين) من النقود. فادركوا بعض ما لم يدركه القدماء من الراصدين وصنفوا المنزيجات اشهرها الزيج المحمد شاهي۔ [1]

جمع کیا، اور انھیں حکم دیا کہ آلات رصدیہ تیار کر کے ان کی مدد سے کواکب کی سیر و گردش کی پیمایش کریں، اور اُن کے دیگر حالات دریافت کریں، بادشاہ نے دہلی، جے پور، بنارس (وغیرہ) میں جے پور کے راجہ جے سنگھ کے زیر انتظام رصدگاہیں تعمیر کرائیں، اور ان پر تیس لاکھ (تین ملین) روپیہ خرچ کیا یہاں کے کارکنوں نے بعض ایسی باتیں دریافت کیں جنھیں قدیم ہیئت دان دریافت نہیں کر سکے تھے، انھوں نے کئی زیجیں تصنیف کیں جن میں سب سے زیادہ مشہور زیج محمد شاہی ہے

تحقیق و تدقیق کا اہتمام

جے سنگھ ہو یا الغ بیگ حاذق ہیئت دان تھے، عبقری روزگار فاضل فلکیات نہیں تھے، نظری علم الہیئت کی ترقی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، انھوں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا، ابتکار فکر کے اظہار کے بجائے انھوں نے عملی (پیمائشی) ہیئت ہی پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز رکھا، اور سیر و گردش کواکب کی پیمائش کی صحت ہی ان کا منتہائے نظر رہا۔ یہ مقصد آلات رصدیہ کے اتقان صنعت کا متقاضی تھا، اور انکی مساعی جمیلہ (بلکہ اسلامی ہیئت کی پوری تاریخ ہی) آلات رصدیہ کی تیاری میں خوب سے خوب تر کی تلاش مسلسل کی داستان ہے، ان کوششوں کا کچھ ذکر دونوں کی رصدگاہوں کے ضمن میں آچکا ہے

[1] نزہۃ الخواطر، الجزء السادس ص ۲۵۸

بہرحال رصدگاہ جے سنگھ کی تیاری اور کارکردگی پر انتہائی فراخدلی سے رقم کثیر صرف کی گئی، علم ہیئت کے ماہرین خصوصی نے اس کے اندر اپنی حذاقت و دستگاہ عالی کا ثبوت دیا، اور اس کے سربراہ کا مقصد وحید از اول تا آخر سیر و گردش کواکب کی صحیح پیمایش کا التزام و اہتمام رہا، ظاہر ہے، ایسی رصدگاہ کی دریافتیں کس درجہ اقرب الی الصحۃ ہونگی۔

صحت پیمایش کے باب میں کارکنان رصدگاہ کی کاوشوں کی پوری تفصیل موجب تطویل ہوگی اس سے بڑی دشواری "زیج محمد شاہی" کے قابل اعتماد نسخہ کی عدم دستیابی ہے، میرے پیش نظر مولانا آزاد لائبریری کے یونیورسٹی کلیکشن کا نسخہ ہے، اس میں شہر اُجین کا عرض بلد "کحـ ل" دیا ہے جو غالباً ۲۸ — ۳۰ دقیقہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے میرے پڑھنے میں، اور نقل کرنے میں غلطی ہو رہی ہو، مگر کسی صورت سے بھی پہلا عدد "کج" (۲۳) اور دوسرا "ی" یا "ے" (۱۰) نہیں ہو سکتا۔ لیکن ٹاڈ نے لکھا ہے کہ راجہ نے شہر اجین کا عرض البلد ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقے شمالی دریافت کیا تھا، جو ہنٹر کے دریافت کردہ ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقہ ۲۴ ثانیہ سے بقدر ۲۴ ثانیہ اختلاف رکھتا ہے [1] ظاہر ہے، یہ بات یا تو ٹاڈ نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے مضمون (جو اس نے ۱۷۹۱ء میں راجہ جے سنگھ کی رصدگاہ اور زیج پر لکھا تھا) یا اس کی اور یادداشتوں سے نقل کی ہے، یا خود بنفس نفیس "زیج محمد شاہی" کا کوئی قابل اعتماد نسخہ اُس کے پیش نظر ہوگا، اور ہنٹر نے تو جے پور کا سفر کیا تھا، وہ ایک باوقار صاحب اقتدار برطانوی آفیسر تھا، ریاستی کتب خانہ جس میں ممکن ہے، "زیج محمد شاہی" کا اصل نسخہ بھی ہو، پوری طرح اس کی دسترس میں تھا، ان وجوہ کی بنا پر میں یونیورسٹی کلیکشن کے نسخہ کی قرأت کے مقابلے میں ٹاڈ کی عبارت کو ترجیح دیتا ہوں،

[1] Tod: Rajasthan, Vol II P 290

لہذا سطور ذیل میں ان کی چند پیمائشی مساعی جن کی دوسرے مصادر سے تصدیق ہو چکی ہے، کا ذکر کیا جا رہا ہے،

ان میں سب سے اہم "میل کلی" Obliquity of The Ecliptic ہے جو قدیم زمانہ سے عہد حاضر تک پیمائشی علم الہیئت کا بڑا دلچسپ مشغلہ رہا ہے،

"میل کلی" نام ہے اس زاویہ کی مقدار کا جو معدل النہار (Celestial Equator) اور منطقۃ البروج (Ecliptic) کے تقاطع سے پیدا ہوتا ہے، یا دائرہ مارہ باقطاب اربعہ کی اس اقصر قوس کا جو معدل النہار اور منطقۃ البروج یا انکے ایک جانب کے قطبوں کے درمیان ہوتی ہو،

قدیم ہند و ہیئت دانوں کے نزدیک یہ مقدار ۲۴ درجہ تھی اور یہی اقلیدس کے زمانہ تک حکمائے یونان کا معمول یہ تھی، چنانچہ ابو ریحان البیرونی "قانون مسعودی" (مقالہ رابعہ) میں کہتا ہے۔

الباب الرابع فی مقدار	باب چہارم: معدل النہار کے منطقۃ
زاویۃ تقاطع معدل النہار	البروج کے ساتھ تقاطع سے جو زاویہ
مع منطقۃ البروج وھو	بنتا ہے اس کی مقدار کے بارے میں
المیل الاعظم	اور وہی میل اعظم (میل کلی) ہو...
فان مقدار ھذا المیل	......اس میل اعظم کی مقدار
الذی یقدر الزاویۃ الحادثۃ	جو اس زاویہ کی پیمائش ہے جو معدل
من تقاطع معدل النہار	النہار اور منطقۃ البروج کے تقاطع
ومنطقۃ البروج، فاتفاق	سے پیدا ہوتا ہے تو وہ حکمائے ہند کے

فرق الھند فیہ علی انہ	فرقوں کے متفق فیصلے کے مطابق ۲۴
اربع وعشرون جزءا[1]	درجہ ہے۔ اور یہی رائے قدیم حکمائے
وکان ھذا فی القدماء	یونان میں شائع و ذائع تھی (اقلیدس
رایا شائعا[2] -	کے زمانہ تک)

اور اسی وجہ سے اقلیدس نے اپنی "اصول الہندسہ والحساب" کے چوتھے مقالہ میں مخمس منتظم (پانچ برابر ضلعوں زاویوں والی شکل) (Regular Pentagon) کے بنانے کا قاعدہ لکھا۔ البیرونی کہتا ہے۔

فان ایران الجانیقی یقول	کیونکہ ایران مجانیقی (Heron -
فی حل شکوک کتاب الاصول	The Mechanicus)
ان اقلیدس انما استخرج	اپنی کتاب حل شکوک اقلیدس میں کہتا ہے
فی المقالۃ الرابعۃ ذا الخمسۃ	کہ اقلیدس نے کتاب الاصول کے چوتھے
ضلعا فی الدائرۃ	مقالہ میں دائرہ کے اندر مخمس منتظم بنانے
ان ھذا مقدار المیل الاعظم[3]	کا قاعدہ لکھا ہے ... اور یہی میل
	اعظم کی مقدار ہے۔

لیکن بعد میں جب ریاضیاتی و پیمائشی علم الہیئت نے ترقی کی تو اس مقدار (۲۴ درجہ) میں تدقیق کا سلسلہ شروع ہوا، چنانچہ حسب تصریح البیرونی ابرخس، اراطیانس اور بطلموس کے نزدیک یہ مقدار ۲۳ درجہ ۵۱ دقیقہ تھی[4]۔

اسکے بعد مسلمانوں کا زمانہ آیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں کتاب المجسطی کا ترجمہ ہوا،

[1] قانون مسعودی جلد اول ص ۳۶۳ [2] ایضاً ص ۳۶۳ [3] ایضاً ص ۳۶۳

نیز عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ جندی ساپور میں قائم ہوئی، جس کے ارصادات "الزیج المشتمل" میں قلمبند ہوئے، مگر سن فارسی کی مدت کے علاوہ اس کے محتویات کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

البتہ جب خلیفہ مامون کے حکم سے ۲۱۴ھ (مطابق ۸۲۹ء) میں بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں قائم کی گئیں تو میل کلی پیمائش بھی کی گئی۔ یحیٰ بن ابی منصور نے جو رصدگاہ مامونی کا سربراہ تھا، اور اس سے پہلے مرو کی ارصادی سرگرمیوں کا بھی نگراں رہ چکا تھا، اس کی مقدار ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقے بتائی۔

اس کے رفقائے کار میں خالد بن عبدالملک المروزی نے ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ ۵۲ ثانیہ اور سند بن علی نے ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ، ۵ ثانیہ (یا ۲۳ درجہ ۳۴ دقیقہ، ۲ ثانیہ) دریافت کی۔[۱]

[لیکن قاضی زادہ نے شرح چغمینی میں رصدگاہ مامونی کی دریافت ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ بتائی ہے][۲]

مامونی رصدگاہ کے بعد اہم اور قابل ذکر ارصادی سرگرمیاں بنو موسیٰ کی تھیں، انھوں نے دو رصدگاہیں قائم کی تھیں، ایک بغداد میں دوسری سامرا میں۔ رصدگاہ سامرا میں یہ مقدار ۲۳ درجہ ۳۴ ـ½ دقیقہ اور بغداد کی رصدگاہ میں ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ متعین کی،[۳] مگر متاخر ہیئت دانوں نے اسی دوسری مقدار کے ساتھ اعتنا کیا، چنانچہ قاضی زادہ رُمی کہتے ہیں:۔

"وھی نہایۃ میل دائرۃ البروج عن معدل النہار ومقدارہا کج لہ

اے ثلث وعشرون جزءاً وخمس وثلثون دقیقۃ علی ما وجد بالرصد

المامون ورصد بنی موسیٰ بعدہا۔"[۴]

۱، ۳؎ قانون مسعودی جلد اول ص ۳۶۶　۲، ۴؎ شرح چغمینی ص ۶۲

(میل کلی دائرۃ البروج کے معدل النہار سے انتہائی فاصلہ کا نام ہے، اس کی مقدار کج لہ ہے، یعنی ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ ہے، مامونی رصدگاہ اور اس کے بعد بنو موسیٰ کی رصدگاہ کی دریافتوں کے مطابق)

اسی زمانہ میں خراسان کی طاہری حکومت کے زیر سرپرستی نیشاپور میں، ایک نئی رصدگاہ قائم ہوئی جس کا سربراہ محمد بن علی مکی تھا، اُس نے اس رصدگاہ میں میل کلی کی مقدار ۲۳ درجہ ۳۴ دقیقہ دریافت کی اور یہی مقدار طاہری امیرزادہ منصور بن طلحہ کی بھی دریافت تھی۔

تیسری صدی ہجری کی آخری چوتھائی میں سلیمان بن عصمہ بلخی کی رصدگاہ میں فلکی مشاہدات کرتا نظر آتا ہے، اس نے اختلاف منظر کے ذریعہ انقلاب صیفی اور انقلاب شتوی کے موقع پر ارتفاع آفتاب کی جو پیمائش کی وہ بغیر تعدیل کے ۲۳ درجہ ۳۴ ـ½ دقیقہ نکلی مگر جب تعدیل کی تو یہ مقدار ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ ۴۲ ثانیہ برآمد ہوئی۔

چوتھی صدی کے آغاز میں بویہی وزیر ابوالفضل بن العمید نے جو انتظام حکومت کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں بھی دستگاہ عالی رکھتا تھا، شہر رے میں کلی کی مقدار دریافت کی، مگر البیرونی کہتا ہے کہ چونکہ اس کے آلات رصدیہ میں کچھ خرابی تھی، اس کی وجہ سے یہ مقدار غیر معمولی طور پر بڑھ گئی، اور ۲۳ - ۴۰ دقیقہ نکلی۔

اس سے پہلے البتانی نے بھی اس کا تجربہ کیا تھا، اور اسے ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ پایا۔ یہی مقدار بعد میں عبدالرحمٰن الصوفی نے شیراز میں اور ابوالوفا البوزجانی اور ابوحامد الصاغانی نے بغداد میں (غالباً رصدگاہ شرف الدولہ کے اندر) پائی۔ اسی زمانہ میں ابومحمود خجندی نے (جو مشہور آلہ رصدیہ سدس فخری کا موجد ہے،) رے کے اندر اس مقدار کو ۲۳ درجہ ۳۲ دقیقہ دریافت کیا۔ البیرونی کہتا ہے کہ خجندی نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ ایک انقلاب (Solstice)

کے موقعہ پر آلۂ رصدی خراب ہوگیا تھا۔

اپنے پیشروؤں کے ارصادات کے بعد البیرونی اپنے ارصاد کا ذکر کرتا ہے، اس نے یہ تجربہ پہلے ۱۰۱۶ء میں خوارزم میں کیا تھا، جب کہ وہ جوان تھا، اور یہ مقدار ۲۳ درجہ ۳۵ ۱/۲ دقیقہ نکلی اس کے بیس سال بعد اس نے یہ تجربہ جرجانیہ میں کیا۔[۱]

رصدگاہ مراغہ میں جو محقق طوسی کی زیر نگرانی کام کر رہی تھی حسب تصریح مولانا عبد العلی برجندی یہ مقدار ۲۳ ۱/۲ درجہ پائی گئی۔

عجم کی آخری رصدگاہ سمرقند میں الغ بیگ نے قائم کی۔ اُس نے میل کلی ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ، ۱۷ ثانیہ پایا، چنانچہ اپنی زیج میں کہتا ہے،

"باب چہارم در معرفت میل اجزاء فلک البروج از معدل النہار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میل کلی برصد ما کج ل یز است۔"[۲]

یہی مقدار مولانا امام الدین ریاضی نے "تصریح" میں بتائی ہے،

واقصر قوس بینہما وبین	ان دونوں دائروں (معدل النہار
قطبیہما ھو المیل الکلی	اور منطقۃ البروج) کے درمیان یا
وھو بالرصد الجدید الذی	ان کے ایک جانب کے قطبوں کے
تولاہ افضل المہندسین	درمیان اقصر قوس ہی میل کلی (کی
مرزا الغ بیگ بسمرقند	مصداق) ہے اور از روئے رصد جدید
کج ل یز ای ثلاثۃ عشرون	جس کا سر انجام افضل المہندسین
درجۃ وثلثون وسبع عشر	مرزا الغ بیگ نے سمرقند میں کیا تھا

[۱] قانون مسعودی جلد اول ص ۴۲۶ وما بعد [۲] زیج الغ بیگ ورق ۱۵ ا

ثانیۃ"[۱] اس کی مقدار کج ل یز ہے یعنی ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ اور ۱۷ ثانیہ

یہ منظر تھا اس باب میں ہمارے رئیس التذکرہ کی ارصادی سرگرمی کا۔ اس نے اسے ۲۳ درجہ ۲۸ دقیقہ قرار دیا، چنانچہ "زیج محمد شاہی" کے دوسرے مقالہ کے تیسرے باب میں کہتا ہے،

"میل کلی برصد سمرقندی کج ل یز و فرنگیان کج لط و ما بتدقیق تمام کج یافتہ ایم"[۲]

[زیج محمد شاہی کے نسخہ یونیورسٹی کلیکشن میں از روئے رصد فرنگیاں یہ مقدار کج لط یعنی ۲۳ درجہ ۳۹ دقیقہ بتائی ہے، ممکن ہے کج کح ہو یعنی ۲۳ درجہ ۲۸ دقیقہ (باسقاط ثوانی) کیونکہ ٹاڈ لکھتا ہے کہ اگلے سال یورپی ہیئت دان نے میل کلی کی جو مقدار دریافت کی وہ جے سنگھ کی مقدار سے صرف ۲۸ ثانیہ کا تفاوت رکھتی تھی][۳]

یہ فاضل راجہ کی حذاقت فنی کا پہلا ثبوت تھا، جس سے علمائے یورپ متاثر ہوئے۔

بعد میں جب ولیم ہنٹر نے ۱۷۹۳ء میں اجین کا عرض البلد دریافت کیا تو اسے بھی راجہ جے سنگھ کے دریافت کردہ عرض البلد سے بہت قریب پایا، صرف ۲۴ ثانیہ کا فرق نکلا اور اس کا بھی ہنٹر کو یقین نہیں ہے، راجہ کا دریافت کردہ عرض البلد ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقہ شمالی تھا، ڈاکٹر ہنٹر کے ارصاد کے مطابق یہ ۲۳ درجہ ۱۰ دقیقہ ۲۴ ثانیہ شمالی تھا، مگر ہنٹر اپنی دریافت پر کلیتاً اعتماد نہیں کرتا، اُس کے خیال میں اس کے اندر ۱۵ ثانیہ تک کی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔[۴]

[آئین اکبری مرتبہ سر سید احمد خاں کی رو سے اجین کا عرض البلد ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ (کج ل) ہے۔[۵]

[۱] تصریح ص ۲۳ [۲] زیج محمد شاہی ورق ۶۶ [۳] Tod: Rajasthan vol. II P. 291 [۴] ... [۵] آئین اکبری ج سوم ص ۳۲

زیج محمد شاہی نسخہ یونیورسٹی کلیکشن کی رو سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا "یہ المحب ل" جو یقیناً غلطی کتابت کا نتیجہ ہے۔

مولوی غلام حسین جونپوری نے "جامع بہادر خانی" میں کچھ اور تقابلی ارصادات کا ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سال شمسی کی مدت۔[1]

ابرخس اور بطلیموس کے نزدیک شہ یدج ہے، (۳۶۵ دن ۱۴ گھڑی اور ۳۴ دقیقہ)

زیج الغ بیگ کی رو سے سہ یدلہ ل ہے (۳۶۵ دن ۱۴ گھڑی ۳۵ دقیقہ ۳۰ ثانیہ)

اور زیج محمد شاہی کے مطابق شہ یدلالوک (۳۶۵ دن ۱۴ گھڑی ۳۱ دقیقہ ۳۶ ثانیہ ۲۰ ثالثہ) اسی طرح آفتاب کی شبانہ روز میں حرکت وسطی۔[2]

ابرخس و بطلیموس کے نزدیک ہا ہا نطح یزیج یب لا (۵۹ دقیقہ ۸ ثانیہ ۱۷ ثالثہ ۱۳ رابعہ ۱۲ خامسہ ۳۱ سادسہ)

زیج الغ کی رو سے ہا ہا نطح نط ما۔ (۵۹ دقیقہ ۸ ثانیہ ۵۹ ثالثہ ۴۱ رابعہ)۔

اور زیج محمد شاہی کے مطابق ہا ہا نطح نط مول (۵۹ دقیقہ ۸ ثانیہ ۵۹ ثالثہ ۴۶ رابعہ ۳۰ خامسہ)۔

تصنیف مصنف کی نظر میں الغ بیگ اور ملا فرید منجم (شاہجہانی) کو اپنے شاہکاروں پر تبصرہ کرنے کے لیے مبصر مل گئے مگر "زیج محمد شاہی" کو کوئی تبصرہ نگار نہیں ملا (یا ہم تک اُس کا تبصرہ نہیں پہونچا)۔

مثلاً۔ "زیج الغ بیگ" کے بارے میں دولت شاہ لکھتا ہے:۔

[1] جامع بہادر خانی [2] ایضاً

"والیوم نزد حکما، آن زیج متداول و معتبر است و بعضے آنرا بر زیج نصیری ایلخانی ترجیح می کنند"۔[1]

اسی طرح ملا فرید منجم کی "زیج شاہجہانی" کے بارے میں محمد صالح کنبوہ رقمطراز ہے:

ملا فرید منجم کہ در تحصیل فن ریاضی . . . . ریاضت تمام کشیدہ بود . . . .

کتاب زیج شاہجہانی . . . . بہمراہی برادر خود ملا طیب وسائر ریاضی دانان روشن ہند و یونان با تمام رسانیدہ بود . . . . اصول و ابواب این کتاب حسابی متضمن فوائد بے شمار و منافع بے حساب بود و ضوابط و قواعد کلی کہ باعث سہولت استخراج و آسانی عمل باشد درطے آن اندراج پذیرفتہ، چنانچہ بالفعل اہل این فن از زیج الغ بیگی مستغنی شدہ استخراج تقادیم ازین کرامت نامہ نامی می نمایند"۔[2]

مگر زیج محمد شاہی کے بارے میں ایسی کوئی تقریظ نہیں ملتی، صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے ماثر الامرا میں صرف اسی قدر لکھا ہے۔

"بیرون بلدۂ مذکور (جے نگر یا جے پور) و بلدۂ شاہجہان آباد ہر دو جا مبالغ کلی صرف نمودہ کارخانہ رصد برپا ساخت، چوں برائے اتمام کار رصد سی سال (کہ مدت تمام دورۂ زحل است) می باید و شمع زندگیش پیشتر ازاں خاموش گردید عمل رصد ناتمام ماند"۔[3]

غالباً یہ "شرح" نہیں "جرح" ہے۔

[1] دولت شاہ:۔ تذکرۃ الشعراء، ۲۴۶ [2] ملا محمد صالح کنبوہ عمل صالح ص ۳۶۱

[3] ماثر الامرا جلد دوم ص ۸۳

بہرحال راجہ اپنی کارگزاری سے خود مطمئن تھا، اور غالباً نازاں بھی، الغ بیگ اپنی زیچ کے آخر میں معذرت خواہ ہے اور حکمۃ کوتاہیوں کا معترف اور

"ملتمس از محاسن شیم و بدائع کرم بزرگان صدرنشین و حکمائے خردہ میں آنکہ چوں بر سہوے و خطائے کہ در انسان صفتے لازمی است، اطلاع یابند بقلم مشکبار و خامہ گوہرنگار آنچہ قابل اصلاح بود تصحیح فرمایند وانچہ از حد تقدیم و تعدیل خارج باشد بذیل عفو ملبوس دستور دارند و عاذر باشند نہ عاذل و ساتر معائب نہ منظر مثالب تاکسوتِ عمال ایشاں بطراز الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰئک الذین هداهم الله واولٰئک هم اولوا الالباب مطرز گردد۔ فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ"[1]

لیکن راجہ کی خود اعتمادی اس رسمی معذرت کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی، وہ اعلان کرتا ہے:۔

"زیچے بنام نامی حضرت ظل الٰہی مشتمل بر اصوب طرق و احسن وجوہ درست کردہ شد کہ بدان استخراج تقادیم در رویت اہلہ و کسوفات و خسوفات و قرانات نمایند اقرب بتحقیق باشد، چنانچہ المعنیٰ بالفعل در رصد خانہ مشاہدہ و مبین می شود"۔[2]

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

---

[1] زیچ الغ بیگی۔ ورق ۲ الف و ب۔ [2] زیچ محمد شاہی ورق ۲ ب

نعت قدسی اور اس کا مصنف[1]

از، ڈاکٹر سمیع الدین احمد ریڈر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

اپریل ۲۰۰۶ء کے معارف میں جناب کالی داس گپتا صاحب (بمبئی) کا مقالہ بعنوان 'غزل قدسی در نعت سرور' جو میرے مضمون، نعت قدسی اور اس کی مقبولیت، (معارف دسمبر ۱۹۰۶ء) کے جواب میں شایع ہوا ہے، نظر سے گذرا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے ایک خالصتہً علمی اور ادبی بحث کو جس کے پیش کرنے میں میں نے بہت محتاط اور متوازن روش اختیار کی ہے، ایک قسم کے مناقشہ کا رنگ دے دیا ہے، میں نے موضوع اور نفس مسئلہ کو بالکل تحقیقی اور علمی نقطۂ نظر سے لکھا ہے، اور مضمون کے ابتدا ہی میں لکھ دیا ہے کہ:۔

"مندرجہ ذیل اسباب اور قرائن کی روشنی میں شاعر کے نام کے ساتھ اس نعت کا انتساب مشتبہ اور مشکوک ہے"

نیز مقالہ کے اختتامیہ جملے ملاحظہ ہوں:۔

"ہمیں امید ہے کہ ان سطور سے جو پیش کی گئیں، نعت قدسی کی تصنیف اور اسکے مصنف اصلی کے تعین میں کسی حد تک مدد مل سکے گی"

---

[1] زیر نظر مقالہ کئی ماہ پہلے مکمل و مرتب ہو چکا تھا لیکن چند مجبوریوں اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے اسوقت بغرض اشاعت ارسال نہ کیا جا سکا۔ تاخیر کے لیے راقم معذرت خواہ ہے۔

قدسی کی نعت یا غزل سے متعلق مختصراً میرے دو بنیادی معروضات ہیں:۔

(۱) اول تو یہ کہ قرائن اور شواہد کی روشنی میں یہ قدسی مشہدی کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی،

(۲) دوسرا معروضہ یہ ہے کہ چونکہ گذشتہ صدی کے بالکل اواخر میں ایک مطبوعہ مجموعہ نعت میں صراحت کے ساتھ اس کی نسبت ایک شاعر قدسی دہلوی سے قائم کی گئی ہے، لہذا یہ امکانی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ اسی موخر شاعر کا نتیجۂ فکر ہو،

میرے پہلے معروضہ کی تردید میں اگرچہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ گپتا صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ یہ نعت قدسی مشہدی ہی کی ہے، لیکن ان کے چند اضافی بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کو اسی شاعر (قدسی مشہدی) کا نتیجۂ فکر سمجھتے ہیں، اس خیال کے تحت انھوں نے اپنے معروضات کے ثبوت میں مندرجہ ذیل بیانات پیش کئے ہیں جن کا جواب میں سلسلہ وار دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ موصوف (ص ۵۰۳ پر) رقمطراز ہیں کہ:۔

"قدسی کے بعد دہلوی لکھنا قطعی سہو کاتب ہے۔"

یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ سہو کاتب سے گپتا صاحب کی کیا مراد ہے، سہو کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، یا تو کاتب نے لفظ "دہلوی" کا اضافہ اپنی جانب سے کر دیا، جدت تحریر اور عقل رسا جس کی عام طور سے اس سے توقع نہیں کی جاتی، دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مشہدی کے بجائے غلطی سے "دہلوی" معرض تحریر میں آگیا ہو، لیکن اس کا بظاہر امکان نہیں اس لئے کہ املا کے اعتبار سے مشہدی اور دہلوی میں بہت فرق ہے۔

یہ تو سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ کاتب حضرات حروف اور الفاظ میں تحریفات اور تصحیفات کرتے رہتے ہیں، مثلاً جان کو خان، لکھ دیا یا پشیمان، کو پشتیبان، لیکن اپنی طرف سے الفاظ کا اضافہ کر دینا عام طور سے سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا، لہذا دہلوی کے لفظ کا یہ اضافہ سہو کاتب کیسے ہو سکتا ہے، بہرحال اگر پہلی صورت حال مراد ہے تو کاتب کا از خود دہلوی کی نسبت اس شاعر کے نام کے ساتھ جوڑ دینا جس کے بارے میں وہ تو وہ گپتا صاحب کے خیال کے مطابق خود مولف صحیفۂ قدسی حاجی شمشیر علی کی واقفیت صفر کے برابر تھی، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے،

اسی نکتہ کے ذیل میں گپتا صاحب کے بیانات میں صریحی تضاد ملاحظہ ہو، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، ایک طرف تو وہ پورے وثوق کے ساتھ قدسی کے بعد دہلوی لکھنے کو "قطعی سہو کاتب" لکھتے ہیں، دوسری جانب یہ فرماتے ہیں کہ "بالفرض حاجی صاحب (یعنی حاجی شمشیر علی مرتب صحیفۂ قدسی نے) قدسی کو جان بوجھ کر دہلوی لکھا بھی ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہ خیال کارفرما ہو سکتا ہے کہ قدسی شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھا، اور اس دربار سے ملک الشعرا کا خطاب اول اس نے پایا تھا۔"

۱؎ گپتا صاحب نے لکھا ہے کہ اگر محمد جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو یہ انکی عدم واقفیت ہے چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے، اسی لئے انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ قدسی حاجی بھی تھے، لہذا انھوں نے احتراماً مولانا لکھدیا،

۲؎ یہ جان بوجھ کر، کا فقرہ قارئین کی خصوصی توجہ کا طالب ہے،

۳؎ شاہجہاں کے دربار دہلی سے منسلک ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ مشہدی ہی کہلاتا آیا ہے نہ کہ دہلوی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دو بیانوں میں سے کسی کو قبول کیا جائے یا کسی کو بھی نہیں، اس سلسلہ میں خود گپتا صاحب کا ذہن صاف نہیں اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں،

مزید یہ کہ اس سلسلہ میں حاجی صاحب کے خیال کی کارفرمائی اور دہلوی کی تاویل جو گپتا صاحب نے کی ہے، دونوں غلط ہیں، شاید گپتا صاحب کو علم نہیں کہ قدسی مشہدی سرے سے دربار شاہجہانی کا ملک الشعراء ہوا ہی نہیں، نہ اول نہ آخر۔

معاصر مورخ محمد صالح کنبو لاہوری صاحب عمل صالح نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، ابو طالب کلیم کی دربار شاہجہانی میں رسائی اور ملازمت اور ملک الشعراء کا عہدہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ۔

"و بعد از جلوس مبارک ملازم سرکار خاصہ شریفہ گشتہ، بہ تحریک بخت کارفرما چوں گفتارش ہوش فریب و دل آویز و طبعش معنی رس و فیض آموز بود بہ خطاب ملک الشعراء امتیاز یافت اگرچہ استحقاق آں منصب جلیل القدر حاجی محمد جان قدسی داشت اما ازیں رو کہ پیش از رسیدن حاجی او بہ این خطاب سرافرازی یافتہ بود، تا دم آخر بر وبحال ماند و تغیرے بداں راہ نیافت[1]۔"

اس کے علاوہ بھی ایسے معاصر اور مستند ماخذ ملتے ہیں، جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قدسی مشہدی کبھی بھی ملک الشعراء نہیں ہوا، لیکن یہاں طول کلام کے خوف سے ہم ان حوالوں کو نظر انداز کرتے ہیں، علاوہ بریں قدسی کو دہلوی کی نسبت سے یاد کرنا صحیح نہیں کیونکہ کسی بھی

[1] عمل صالح ج ۳ ص ۴۰۲،

معاصر یا متاخر مورخ، تذکرہ نگار یا شاعر اور ادیب نے اس کو دہلوی نہیں لکھا، نیز اس کی مستقل سکونت بھی دہلی میں کم ہی رہی، اپنے قلیل مدت قیام میں اس نے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت بھی کی، مثلاً آگرہ، کشمیر، لاہور وغیرہ۔

شاہجہان کے پانچویں سال جلوس یعنی سنہ ۱۰۴۱ھ ۱۰۴۲ھ میں وہ ہندوستان پہونچا، اور کم و بیش ۱۰ سال بعد یعنی سنہ ۱۰۵۶ھ میں انتقال کر گیا، اس کی وفات بھی دہلی میں نہیں ہوئی، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بنیاد پر حاجی شمشیر علی جیسے ناواقف اور ناقل محض شخص نے اس کو دہلوی لکھ دیا، اور وہ بھی بڑی علمی سوجھ بوجھ کے ساتھ اور عمداً!

ایک طرف تو گپتا صاحب کے بیان کی روشنی میں حاجی صاحب بالکل ناواقف تھے، دوسری طرف ان کو قدسی مشہدی کے بارے میں اتنی ساری معلومات بھی حاصل نہیں؟ عقل کام نہیں کرتی کہ اس تضاد کو کس چیز پر محمول کیا جائے،

۲- اسی ضمن میں اسی صفحہ (۳۰۶) پر گپتا صاحب نے لکھا ہے کہ۔

"حاجی صاحب خود سرورق پر صحیفہ قدسی کو مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان بر غزل مولانا محمد جان صاحب قدسیؒ لکھتے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی قدسی دہلوی ہوتے تو وہ ان تضمینوں کو مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان کیوں لکھتے۔ کیا دہلوی شاعر شعرائے ہندوستان سے الگ ہیں؟

جواب میں عرض ہے کہ اگر شعرائے ہندوستان نہ لکھتے تو کیا شعرائے ترکستان یا شعرائے افغانستان وغیرہ لکھتے؟ اس سے صرف یہ مراد ہے کہ سارے ہندوستان

کے مختلف حصوں اور گوشوں کے شعرا، اور یہ بات ان مجموعوں کے مطالعہ سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ اس نعت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ملک کے ہر حصہ کے شاعروں نے تضمین نگاری میں ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیا تھا، ایسا نہیں تھا کہ صرف دہلی یا اس کے قرب و جوار کے شعرا نے ہی تضمینیں لکھ ڈالی ہوں "شعرائے ہندوستان" کے فقرہ سے محض یہ بتانا مقصود ہے کہ اس وسیع پیمانہ پر اس نعت پر خمسے لکھے گئے کہ ملک کا شاید کوئی بھی گوشہ باقی نہ رہا[1]۔

۳- اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحسین کی "خمسہائے غزل قدسی" کے صفحہ ۹۹ پر عنایت اللہ قیس کے قطعہ تاریخ کا ذکر گپتا صاحب نے کیا ہے اور پہلا شعر درج کرنے کے بعد تیسرا شعر نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

شاعروں نے جو لکھے ہند کے خمسے اس کے — جن کے ہر بند پہ قربان ہو دل و جان اسکا

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں۔

"اس شعر کے مصرعہ اول سے صاف ظاہر ہے کہ ہند کے شاعروں نے خمسے اس شاعر کے کلام پر لکھے ہیں، جو خود ہندوستان کا رہنے والا نہیں ہے"۔

جواب میں عرض ہے کہ پہلے مصرعہ میں "ہند کے" فقرہ سے ہندوستانی اور ایرانی شاعروں میں امتیاز اور فرق کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں غالباً اس بات کی صراحت مقصود ہے کہ صرف ایک محدود یا مخصوص حصہ ملک نہیں پورے ہندوستان کے شاعروں نے خمسے لکھے بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ امتیاز کرنا مقصود ہے

---

[1] اس موضوع کی وضاحت گذشتہ مضمون میں کی جا چکی ہے۔

اور مولف نعت ہذا کوئی ایرانی النسل شاعر ہی ہے تو بطور اطلاع عرض ہے کہ پندرھویں یا سولہویں صدی عیسوی سے لے کر عصر حاضر تک ایک دو نہیں، متعدد ایرانی شاعر اس تخلص کے گذرے ہیں، خود ہمارے ملک میں اسی صدی میں اکا دکا شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کا تخلص قدسی تھا، اور جن کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے[1]۔

میں اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اگرچہ قدسی مشہدی ایرانی نژاد تھا لیکن وہ ہندوستان ہی میں، لاہور میں فوت ہوا تھا، اور وہیں دفن بھی ہوا، ملک الشعراے دربار شاہجہاں ابو طالب کلیم نے جو قدسی کا قریبی اور مخلص دوست، ندیم خاص اور ہمکار بھی تھا، ایک بہت عمدہ اور پر اثر مرثیہ ایک طویل ترکیب بند کی صورت میں اس کی موت پر لکھا ہے جس کا ایک قابل توجہ شعر یہ ہے۔

شد بہ لاہور گران گنج معانی در خاک — رفت اطلس و لی غلغلۂ نوحہ گرش

۴- آگے چل کر اسی صفحہ پر گپتا صاحب نے مزید اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحسین ہی کے مجموعہ (ص ۳) کا حوالہ دیتے ہوئے حاجی محمد اسحاق کے خمسہ کا ذکر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ۔

تحسین ہی کے مجموعہ کے ص ۳ پر حاجی محمد اسحاق اسحاق کا خمسہ ہے، اس کا پہلا بند دیکھئے[2]۔

ہے بہ اسحاق ترا ایک غلام عجمی — اس پہ ہو یک نگہ لطف رسول عربی

---

[1] اس موضوع کی تفصیل انشاء اللہ ایک جداگانہ مضمون کی شکل میں معارف کی کسی آئندہ اشاعت میں پیش کی جا سکے گی، [2] میرے سامنے جو حدیث قدسی کا نسخہ ہے اس میں یہ بند آخر میں درج ہے، یعنی پہلا بند نہیں بلکہ آخری بند ہے،

"ترے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی ...."

اس غلام عجمی کا ذہن قدسی کے بارے میں قطعی صاف ہے، وہ اسے سعدی اور ظہیر فاریابی کے ساتھ رکھتا ہے، خسرو اور فیضی کے ساتھ نہیں،

اس اعتراض میں کئی قباحتیں ہیں، جن کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ حاجی محمد اسحاق کی حیثیت کسی مستند مورخ معتبر تذکرہ نویس یا کسی ذی علم شاعر کی نہیں ہے وہ ایک معمولی درجہ کا شاعر معلوم ہوتا ہے لہذا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس ادنیٰ درجہ کے شاعر کا علمی معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا ہوگا،

دوسرے یہ کہ محض ذکر قدسی سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ شاعر کا اشارہ قدسی مشہدی کی طرف ہے، جب کہ یہ یقین ہے کہ قدسی مشہدی کے علاوہ متعدد دوسرے ایرانی اور ہندی النسل شاعر بھی اسی تخلص کے ہوئے ہیں، تیسری بات یہ کہ حاجی محمد اسحاق کی عدم واقفیت اور علمی کم مائیگی کے سلسلے میں صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ وہ نعت گو شعرا کی فہرست میں قدسی کے نام سے پہلے ظہیر کا نام لیتا ہے، اس جگہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ تضمین نگار نے صرف ظہیر لکھا ہے، البتہ گپتا صاحب نے اپنی جانب سے فاریابی کا لفظ غالباً اس بنا پر کہ وہ زیادہ مشہور رہے، محض اندازہ سے بڑھا دیا ہے، حالانکہ اس نام کے بھی کئی شاعر گذرے ہیں، مثلاً ظہیر دہلوی، ظہیر اصفہانی وغیرہ لہذا قطعاً نہیں کہا جا سکتا کہ ظہیر فاریابی مراد ہے یا کوئی اور ظہیر، ہماری حقیر رائے میں قطعیت کے ساتھ ظہیر فاریابی کا نام لکھتے وقت گپتا صاحب کو پہلے اس شاعر کی حیثیت بطور ایک ممتاز نعت گو سخن ور متعین کر لینی چاہئے تھی، اور اس بات کی

تصدیق کر لینی چاہئے تھی، کہ آیا وہ نعت گوئی میں نمایاں درجہ رکھتا بھی ہے یا نہیں محض اندازہ سے ظہیر فاریابی لکھ دینا مناسب نہ تھا، بہرحال اگر ظہیر فاریابی مراد ہے، جیسا کہ گپتا صاحب نے از خود اضافہ کر دیا ہے، تو یہ عرض ہے کہ ظہیر فاریابی کا شمار قطعاً نعت گو شعرا میں نہیں ہوتا، وہ ایک خالص مدح گو اور درباری شاعر تھا، اس کو نعت گوئی سے کیا سروکار البتہ خاقانی، جامی، رومی، عطار، احمد جام، نظامی، شاہ نعمت اللہ کرمانی وغیرہم جیسے شاعروں میں سے کسی کا نام لیا جاتا تو بات بن سکتی تھی، اب اس حقیقت کی روشنی میں یہ مصرعہ ؏ "ترے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی" پڑھئے تو حاجی محمدؐ اسحاق کے بیان کا کھوکھلا پن سب روشن ہو جائے گا۔ تلاش و تحقیق تو یہ کہتی ہے کہ ظہیر سرے سے نعت کا شاعر ہی نہیں اس لیے کہ اس کے کلام کا بہت بڑا حصہ قصائد اور مدحیہ نظموں پر مشتمل ہے۔

بہرحال جو شاعر علمی اعتبار سے اس درجہ کا ہو کہ ظہیر دیگر نہیں ظہیر فاریابی یا کوئی اور ظہیر کو مداحان رسولؐ میں گردان دے، اس کے قول پر کیا بھروسہ کیا جائے، معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس نے محض وزن شعر پورا کرنے کے لیے سعدی اور ظہیر کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے ایک نئے معنی گپتا صاحب نے پہنا دے ہیں، اس کے علاوہ حاجی محمدؐ اسحاق اگر چاہتے بھی تو خسرو اور فیضی کے نام نہیں لا سکتے تھے، اس لیے کہ وہ خارج از وزن و بحر ہوتے اگر اتفاق سے قدسی سے پہلے ان دو شاعروں کے نام آ گئے، جو ایرانی تھے، تو نعت نگاری کا صرف ایرانی شاعروں اور تضمین نگاری کا صرف بیشتر اردو نویس ہندوستانی کے لئے ہی مخصوص ہو جانا ایک ایسا امر ہے جس کو عقل قبول کرنے سے قاصر ہے،

(باقی)

لاہور میں علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس کا جشن

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۳)

۵ دسمبر ۷۷ء کو دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا اس کی صدارت ترکی کے ڈاکٹر عبدالقادر کرہانی نے کی، اُن کے ساتھ ڈاکٹر رفیق احمد صدر تھے، جو پنجاب یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہیں سکریٹری جناب محمد وارث میر ہوئے، اس میں یہ مقالات پڑھے گئے،

(۱) Some Reflections on Philosophical aspects of Iqbal's philosophy - از پروفیسر ڈاکٹر سید النجیب العطاس (ملیشیا)

(۲) Allama M. Iqbal and Mehmet Akil Ersov - از پروفیسر ڈاکٹر ثنات کاگ تو (روس)

(۳) Afore runner of Pakistan turkish friendship - از ڈاکٹر فوات بازم اگلو (ترکی)

(۴) Role of Iybal in the Creation of Pakistan

از مادام پیری ہان آری بوردون (ترکی)

(۵) Iqbal as a believer in Islam. از ڈاکٹر لطفی ڈوجن (ترکی)

(۶) Iqbal's relevance to-day از جناب عنایت اللہ صاحب (لاہور)

(۷) Iqbal's Concept of Muslim Revival از ڈاکٹر محمد کلیم (بنگلہ دیش)

(۸) Iqbal and Walt Whitman: East and West Meet - از پروفیسر لتیم فیفر (نیو میکسیکو)

کافی اور چائے کے بعد پھر دو اجلاس ہوئے، ایک کی صدارت ملیشیا کے پروفیسر ڈاکٹر سید النجیب العکاس نے کی، ان کے ساتھ ڈاکٹر منیر خیتائی شریک صدر تھے، جو پنجاب یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں، سکریٹری ڈاکٹر امان اللہ ہوئے، اس میں یہ مقالات پڑھے گئے

(۱) Research into Iqbal's life and works in The Soviet union - از ڈاکٹر سوخاچیو (روس)

(۲) Iqbal: A Giant of our planet از ڈاکٹر گیفورد (روس)

(۳) The vision of Iqbal از ڈاکٹر شام افتخار،

(۴) Intdividual and Society in Iqbal - از ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی (اڈنبرا)

(۵) Iqbal to be rediscovered از راقم الحروف

(۶) علائقِ اقبال با افغانستان از میر حسین شاہ (افغانستان)

(۷) A Tribute to Iqbal از احمد حسین صاحب،

ہر مقالہ خواں کے لئے دس منٹ مقرر تھے، میرا مقالہ پندرہ صفحے کا تھا، مگر میں نے اس کو دس منٹ کے لحاظ سے مختصر کر لیا تھا، اس میں پہلے تو یہ دکھایا تھا کہ مولانا شبلیؒ نے اقبال کے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی کہ حالی اور آزاد کے بعد شاعری میں جو کرسیاں خالی ہوں گی، ان میں ایک اقبال سے پر ہوگی، یہ پیشین گوئی پورے طور پر صحیح ثابت ہوئی، پھر استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اقبال کی وفات پر جو کچھ لکھا تھا، اس کا اقتباس سنایا، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم اور جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کی جو رائیں اقبال سے متعلق تھیں، ان کا ذکر کیا، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب Glory of Iqbal کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال کے بارہ میں ان کی رائے بھی نقل کی، اس کے بعد یہ ظاہر کیا کہ اقبال کے مطالعہ میں دارالمصنفین کا ایک خاص زاویۂ نظر ہے اسی بنا پر یہ راقم السطور اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا ہے، کہ اقبال محض یورپ کے فلسفیوں کی رٹ کو ہانکتے رہے بلکہ اُن کا مسلک قرآن مجید کی تعلیمات پر مبنی تھا، انھوں نے فلسفۂ خودی کو کلام پاک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور صحابہ کرام کے عشق رسولؐ سے اخذ کیا، پھر ان کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ انھوں نے افلاطون، ارسطو، کانٹ، میکڈ انلڈ، فرائڈ، ولیم جیمس، برگساں، میک ٹگاوٹ، فرنل، نطشے، اسپنگلر، ژنگ، ٹالسٹائے، اور لاک وغیرہ سب ہی سے اختلاف کیا ہے، وہ ان کے نظری اور فکری خیالات کے بڑے ناقد رہے ہیں، ان کے بجائے وہ کلام پاک کے مطالعہ سے اسرار الٰہی کے محرم بنے، عشق رسول سے سرشار رہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت اویس قرنیؓ، حضرت بلالؓ کی زندگی سے اپنی شاعری

کے محبوب موضوع عشق کا درس لیا، پھر حکمائے اسلام میں مولانا رومی کے علاوہ بوعلی سینا، سنائی، فارابی، ابن خلدون، ابن حزم، فخر الدین رازی، ملا باقر، عراقی، ابن تیمیہ، ابوالدولہ سنجانی، شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی، اور سرسید احمد خاں سے بھی متاثر ہوئے، وہ بگڑے ہوئے تصوف کے ضرور ناقد تھے لیکن حقیقی تصوف کے ہمیشہ حامی رہے، اور صوفیائے کرام سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے،

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی — نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ انکو — ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو — وہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں

ان کا موضوع تصوف نہ تھا، لیکن اپنے خیالات کے اظہار میں وحدت الوجود کے منکر نہیں تھے، ان کا وحدۃ الوجود اپنا تھا، بیسویں صدی کا تھا، وہ وحدت الوجود کے حامیوں کی طرح اپنے کو خدا میں جذب ہونے کے بجائے خدا کو اپنے میں جذب ہوتا دیکھنا پسند کرتے تھے، کہتے ہیں:-

بخود گم بہر تحقیق خودی شو — انا الحق گوے و صدیق خودی شو

ضرب کلیم میں کہتے ہیں:-

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر — اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

انھوں نے اپنی شاعری میں عشق کے جو فلسفیانہ رموز و نکات بتائے ہیں، وہ کسی قلوپطرہ، کسی جولیٹ، کسی لیلیٰ، کسی عذرا اور کسی شیریں کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ خالصتاً عشق الٰہی ہے، جو وحدۃ الوجود کا دوسرا نام ہے،

صوفیائے کرام میں وہ حضرت فضیل بن عیاضؒ، جنید بغدادیؒ، بایزید بسطامیؒ، داتا گنج بخشؒ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، امیر خسروؒ، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، اُن کی تعلیمات کا پرتو اُن کی شاعری پر ہے، شعراء میں مولانا رومی کے علاوہ فرید الدین عطار، خاقانی، بو علی قلندر پانی پتی، عرفی، طالب کلیم، صائب، فیضی، رضی دانش، عبد القادر بیدل، غنی کشمیری، غالب اور داغ سے متاثر ہوئے، اسلامی تاریخ کی سیاسی شخصیتوں میں سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، طارق بن زیاد، عبد الرحمٰن اول اندلسی، سلیم، سنجر، طغرل، محمود غزنوی، مراد، اورنگ زیب، اور ٹیپو سلطان کی سیرت و کردار کا اثر ان کی شاعری میں نمایاں ہے، ان حقایق کے بعد یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے، کہ وہ فرنگی مفکروں کی گاڑی کے قلی بنے رہے، درحقیقت وہ اسرار الٰہی کے محرم رسول اللہ کے عاشق، فلسفۂ اسلام کے ترجمان، اور کاروانِ ملت کے حدی خوان بن کر شاعری کرتے رہے، اسی حیثیت سے انھوں نے خودی، اجتماعی خودی، عظمت آدم، شرف انسانی اور تسخیر فطرت کا پیام دنیا اور انسانیت کو سنوارنے کے لیے دیا، اسی لئے ان کی شاعری میں ابدیت کی لذت برابر ملتی رہے گی، ہم نے اگر اقبال کو اس جشن کے موقع پر صحیح معنوں میں پا لیا، تو ہم اپنے کو بھی اسی حیثیت سے پالیں گے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر انسان کی خودی کو ایک نیا درس دیا ہے، اسلام کے روحانی، مذہبی اور ذہنی راز سربستہ کو کھول کر ایشیا کے رہنے والوں کے دل کے اندر نیا سوز، ساز اور درد عطا کیا ہے، فرنگی فکر کے نشہ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، انسان کو بلند کر کے کائنات کا حکمراں بننے کی دعوت اور انسانیت میں آفاقیت اور عالمگیریت پیدا کرنے کا پیام دیا ہے،

میرا یہ مضمون انگریزی میں تھا جس کا خلاصہ اوپر پیش کیا ہے، جب میں اپنا یہ مقالہ پڑھ رہا تھا، تو وہاں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال بیٹھے تھے۔ ان کو سامنے

دیکھ کر مقالہ پڑھنے میں بہت جی لگا، یہ خیال غالب رہا کہ ان کا سن لینا ہی میری محنت کا اصلی صلہ ہوگا، جب میں نے مقالہ ختم کیا، تو وہ اٹھے اور بڑی گرم جوشی اور محبت سے ہاتھ ملایا، داد دی، پھر باہر نکل کر کہنے لگے کہ

"It was very gripping and interesting"

یہ اجلاس ختم ہوا تو پیرس کی ایک خاتون لپکتی ہوئی میرے پاس آئیں، اور مبارکباد پیش کرتی ہوئی بولیں کہ میں اس مقالہ سے بہت محظوظ ہوئی، اور میں نے بہت کچھ سیکھا، آگے بڑھا تو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا سے ایک صاحب کچھ باتیں کر رہے تھے، مجھکو دیکھتے ہی بولے، آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا ہے، میں نے کہا کہ کوئی شکایت تو نہیں پیدا ہو گئی، بولے نہیں، ہم لوگ کہہ رہے تھے کہ آپ کا مقالہ اس کانگریس کا بہترین مقالہ قرار دیئے جانے کے لائق ہے، سندھ کے ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل نے اس رائے کو سن کر کہا کہ میں بھی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کراچی کے جناب اعجاز الحق قدوسی مؤلف "اقبال کے محبوب صوفیائے کرام" اپنی محبت میں یہ کہہ گئے کہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ کانگریس کا بہترین مقالہ تھا، دوسرے دن جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ کچھ بیرونی نمائندے ان سے کہہ رہے تھے کہ یہ مولانا کیسے اتنی اچھی انگریزی میں اتنا اچھا مقالہ لکھ سکے، میں یہ سن کر ہنسنے لگا، دل میں خوش تھا کہ اللہ نے دار المصنفین کے معیار اور وقار کی لاج رکھ لی،

میں نے جس اجلاس میں اپنا مقالہ پڑھا تھا اسی کے ساتھ دوسرا اجلاس اسی وقت دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا جس کے صدر مصر کے ڈاکٹر حسین مجیب تھے، اُن کے ساتھ ڈاکٹر حسن رفعت رشید صدر تھیں، جو پنجاب یونیورسٹی کی آرٹ فیکلٹی کی ڈین ہیں، سکریٹری ڈاکٹر خواجہ

غلام زکریا تھے، اس میں یہ مقالے پڑھے گئے،

(۱) Allama Muhammad Iqbal and the German-Philosophy - از ڈاکٹر ہل تر ودرستو (جرمنی)

(۲) Iqbal and Renaissance of Islam
از پروفیسر ڈاکٹر حمکا (انڈونیشیا)

(۳) Iqbal: His portraits and handwriting
از سلیمہ سلطانہ (پاکستان)،

(۴) اقبال اور پان اسلام ازم از ڈاکٹر پروین شوکت (لاہور)

(۵) Iqba and the material well being of the-Muslims - از جناب لطیف احمد صاحب شروانی

(۶) Metaphysical implication of Iqbal-Epistemic views از ڈاکٹر محمد معروف (لاہور)

(۷) Iqbal's concept of mental health
از ڈاکٹر ایس۔ ام۔ رحمان (پاکستان)

(۸) اقبال اور وحدت الوجود، از جناب امیر حمزہ شنواری (پاکستان)

سہ پہر کو لاہور کے خانۂ فرہنگ ایران میں ایک استقبالیہ عصرانہ تھا، اس میں پہلے مقالہ خوانی ہوئی، اس کی صدارت ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے کی، اس موقع پر جناب بہاؤالدین اورنگ نے پہلے استقبالیہ خطبہ پڑھا، پھر تہران یونیورسٹی کے پروفیسر جعفر محمد محجوب اور پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالشکور احسن نے اپنے اپنے مقالات پڑھے، اس کے

بعد صدر نے اپنا خطبہ پڑھا، پھر ایران کے قونصل جنرل نے وہاں کے ایک کتب خانہ کا افتتاح کیا جس کا نام علامہ محمد اقبال لائبریری رکھا گیا ہے، ایک بہت پرتکلف عصرانہ بھی رکھا گیا تھا ہم لوگ ہوٹل واپس آئے، تو خانۂ فرہنگ کی طرف سے رات کا ڈنر بھی تھا، جس میں حسب معمول انواع واقسام کے کھانے تھے،

۲۶ر دسمبر کی صبح کو پھر دو علیحدہ علیحدہ کمروں میں مقالہ خوانی کے چار اجلاس ہوئے ایک اجلاس کی صدارت ڈاکٹر غلام رضا صابری تبریزی نے کی، جو اڈنبرا یونیورسٹی کے استاذ ہیں، ان کے ساتھ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صدر ہوئے، اور سکریٹری ڈاکٹر خالد حمید شیخ تھے، اس میں یہ مقالے پیش ہوئے،

(۱) A Tribute to Iqbal از جناب حمد حسین پاکستان،

(۲) بانگ درا کی طویل نظموں کے پس منظر کا ایک مطالعہ، از جناب سید ابوالخیر کشفی (کراچی یونیورسٹی)

(۳) اقبال اور گورنمنٹ کالج، از جناب محمد حنیف شہید، لاہور

(۴) Therapeutic Aspects of Iqbal's thoughts - از جناب ڈاکٹر بدر [illegible] (لاہور)

(۵) Iqbal and Syed Ali Hamadani از ڈاکٹر جیرہارڈ باورنگ (مغربی جرمنی) (۶) محمد اقبال: امیر شعراء اسلام، از عبدالودود شابلی (مصر)

(۷) Iqbal and high ideals of Islamic State
از پروفیسر مولانا الٰہی بخش جاراللہ

(۸) Iqbal's advice to the young از جناب محمود ولی،

اسی وقت دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا، اس کی صدارت فرانس کی میڈم ایوا میورووِچ کر رہی تھیں، ان کے ساتھ صدر جسٹس محمد یوسف صراف تھے، سکریٹری محمد اسمٰعیل بھٹی ہوئے، اس میں یہ مقالے پڑھے گئے،

(۱) Iqbal: A poet of the East از جناب علی سردار جعفری (ہندوستان)

(۲) Iqbal's Andalusian Themes از ڈاکٹر محمد یوسف عباسی (پاکستان) (۳) اقبال کی دعائیں از پروفیسر شریف کنجاہی (پاکستان) (۴) آفاقی شاعر اور مفکر اقبال کا پیغام حیات از ڈاکٹر ابو سعید نور الدین (بنگلہ دیش) (۵) کلام اقبال پر احادیث نبوی کا اثر از مریم سلطانہ صاحبہ (پاکستان) (۶) اقبال اور ایران از ڈاکٹر نسیم (پشاور) (۷) علامہ اقبال پر کتابیات، از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، (سرگودھا) (۸) Iqbal on observation of Nature, God, Knowledge - از جناب عبد الخالق صاحب (پاکستان)

چائے کے بعد دو علیحدہ کمروں میں جو اجلاس ہوئے، ان میں سے ایک کی صدارت امریکہ کے لیتھم فیفر نے کی، ان کے ساتھ ڈاکٹر عبد الحمید (لاہور) صدر تھے، سکریٹری ڈاکٹر ذاکر واجد شیخ ہوئے، اس میں یہ مقالے پیش ہوئے،

(۱) Dialogue in Iqbal - از ڈاکٹر محمد اجمل (اسلام آباد)

(۲) اقبال اور ہمارے فکری رویے، از ڈاکٹر سلیم اختر (۳) اقبال کے نظریہ فنون لطیفہ میں فنِ تعمیر، از ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی، (لاہور) (۴) اقبال کی ابتدائی فارسی شاعری از ڈاکٹر صابر آفاقی (آزاد کشمیر) (۵) علامہ اقبال کا معاشی مقصد از ڈاکٹر معز الدین

(ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی لاہور) (۶) صوفیانہ افکار و نظریات میں اقبال کے مجددانہ تصرفات از مولانا نور احمد فریدی (۷) اقبال کی اردو غزل از جناب رفیق خاور (لاہور) (۸) Iqbal: The poet of Man از ڈاکٹر شمس الدین صدیقی (پشاور) (۹) The Naturalism of Iqbal از پروفیسر عبد القیوم (پشاور)

اسی اجلاس میں پروفیسر آل احمد سرور نے اردو میں ایک اچھی تقریر کی جس میں یہ ظاہر کیا کہ اقبال مغرب اور مشرق دونوں کی اعلیٰ قدروں سے متاثر ہوئے، اسی وقت دوسرے کمرہ میں جو اجلاس ہو رہا تھا، اس کی صدارت انڈونیشیا کے ڈاکٹر حمکا نے کی، ان کے ساتھ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین صدر ہوئے، سکریٹری ڈاکٹر ظہور احمد اظہر تھے، اس میں یہ مقالے پیش ہوئے،

(۱) Iqbal's view of space and time از ڈاکٹر فاضل احمد شمسی (اسلام آباد)

(۲) Rumi and Iqbal از میاں سید رسول رسا (پشاور)

(۳) علامہ اقبال اور تحریک پاکستان از ڈاکٹر انعام الحق کوثر،

(۴) Introducing Iqbal to western - Readers - از فیض احمد فیض (لاہور)

(۵) اقبال اور مغربی جمہوریت، بالشوزم اور اسلام از احسان اکبر (پاکستان)

(۶) علامہ اقبال خانقاہ نشین صوفی، از جناب محمد ایوب قادری (کراچی)

اس کے بعد مقالہ خوانی کے اجلاس ختم ہو گئے، مقالات کی مذکورہ بالا فہرستوں سے

اندازہ ہوگا کہ اس کانگریس میں اقبالیات سے متعلق جتنے پہلو ذہن میں آسکتے تھے، ان سب پر مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور ہر مقالہ نگار کو اپنا مقالہ پڑھنے کا موقع دیا گیا، اس سے مقالہ نگاروں کو بظاہر تو تسکین ضرور ہو جاتی تھی، مگر بعض اوقات مقالے وقت کی تنگی کی وجہ سے ایسی عجلت میں پڑھے گئے کہ پڑھنے اور سننے دونوں میں کوئی لذت نہ ملتی تھی، بعض مقالہ نگاروں نے بڑی محنت اور کاوش سے مقالے لکھے، جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ غور سے پورے سنے جاتے اور اُن پر بحث و مباحثہ ہوتا، لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا، کسی مقالہ پر کوئی بحث نہیں ہوئی، مگر اتنے مقالات پڑھے اور سنے گئے کہ میرا خیال ہو کہ ہر مندوب نے اس کانگریس میں شرکت کرکے کچھ نہ کچھ نئی اور مفید چیزیں ضرور حاصل کیں،

اسی روز شام کو جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے استقبالیہ تھا، وہ اس وقت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے پاکستان میں بہت مقبول ہیں، اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، فوجی وردی میں ملبوس تھے، عام پاکستانیوں کی طرح اُن کی مونچھیں صاف نہ تھیں بلکہ اُن کی مونچھوں سے اُن کی مردانگی اور سپہگری کا اظہار ہوتا تھا، ہنستا ہوا چہرہ تھا، بات بات پر ہنستے ہوئے دکھائی دیے، شامیانے میں داخل ہوئے تو میری شیروانی کی جیب پر انڈیا لکھا ہوا تھا، میری طرف بڑھے ہنس کر پوچھا کہ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے، میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں اُن کے لئے ہندوستان سے کچھ علمی تحفے لایا ہوں، پھر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور اپنی کچھ تصانیف اُن کی خدمت میں پیش کیں، انھوں نے ان کو قبول کیا، تو فوٹو گرافروں نے آگے بڑھ کر تصویریں لیں، میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ گذشتہ سال میرے ذریعہ سے پورا دارالمصنفین پاکستان کو نذر کر دیا گیا ہے، یہ سن کر ہنسنے لگے، میں نے عرض کیا کہ دارالمصنفین ہی کے سلسلہ میں آپ کی خدمت میں کچھ باتیں عرض کرنی ہیں، اُس کے لئے

اسلام آباد آکر ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہوں گا، جواب دیا کہ اسلام آباد میں ضرور ملئے، ہندوستان کے اور دوسرے نمائندوں سے بھی بہت ہی حسن اخلاق سے ملے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے دیر تک باتیں کرتے رہے..... اس استقبالیہ میں بکثرت مدعوئین تھے، مغرب کا وقت ہوا تو جنرل صاحب نماز پڑھنے کے لئے اُٹھ گئے، نماز باجماعت کا اہتمام کیا گیا تھا، مگر سیکڑوں مدعوئین میں سے صرف پندرہ بیس آدمی نماز میں شریک ہوئے، نماز کے بعد مصلیوں سے جنرل صاحب نے بے تکلفانہ گفتگو کی، میری طرف بھی بڑھے، میں نے اس وقت دارالمصنفین اور حکومت پاکستان سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی کچھ اور تفصیل بتائی، اور اسلام آباد میں پھر شرف ملاقات کیلئے وقت کا طالب ہوا، انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس کانگریس کے بعد اسلام آباد میں آسکونگا، میں نے عرض کیا کہ ابھی تو کراچی جاؤں گا، وہاں سے اسلام آباد حاضر ہوں گا، یہ معلوم کرکے انھوں نے اپنے سکریٹری کو کراچی میں میرا پورا پتہ لکھ لینے کو کہا، سکریٹری صاحب نے میرا پتہ لکھ کر کہا کہ مجھ کو اسلام آباد آنے کی تکلیف دیجائے گی، یہ شام پرتکلف چائے، اور جنرل صاحب کی بے تکلفانہ ملاقات کی وجہ سے بڑی خوشگوار رہی،

رات کو پرتکلف کھانے کے بعد کچھ ماہرین موسیقی نے اقبال کی غزلوں کے ساتھ سندھی، پنجابی، اور بلوچی گیتوں سے بھی مندوبین کو محظوظ کیا،

۸ دسمبر کو الوداعی اجلاس تھا، مندوبین پھر پنجاب یونیورسٹی کے فیصل ہال میں جمع ہوئے، پنڈال افتتاحیہ اجلاس کی طرح سجا ہوا تھا، اسٹیج پر بیٹھنے والے خصوصاً پاکستانی زیادہ تر انگریزی لباس میں ملبوس تھے، جنرل ضیاء الحق تالیوں کی گونج میں ڈائس پر تشریف لائے، کارروائی کلام پاک کی تلاوت سے شروع ہوئی، پھر جناب بشیر حسین ناظم نے اپنے پرکیف ترنم سے اقبال کی وہ نظم سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے:-

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہے دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

جب یہ نظم ختم ہوئی تو جنرل ضیاء الحق، اٹھ کر جناب بشیر حسین ناظم سے بغل گیر ہوئے اور اُن کے اندازِ ترنم کی تعریف کی، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے استقبالیہ خطبہ پڑھا پھر مندوبین میں ان کے ایک ایک نمائندہ کو اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے ڈائس پر مدعو کیا گیا افغانستان کے پروفیسر محمد ابراہیم الہام نے کہا افغان قوم حکیم الامت اقبال کے عظیم نظریات اور فلسفیانہ شاعری کے علاوہ انھوں نے انسانیت اور اتحادِ عالم کے لئے جو بیانات دئیے ہیں اُن سے بخوبی آشنا ہے' بنگلہ دیش کی بیگم اختر امام نے کہا کہ علامہ اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے ہی لئے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لئے ہے' اقبال سب کے ہیں، مصر کے ڈاکٹر محمد جمال الدین نے کہا کہ علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کو ایک خاندان تصور کرتے تھے، فرانس کی میڈیم ایوا میورووچ نے اقبال کے پیام کو دنیا بھر میں پھیلانے کی ضرورت پر زور دیا، ہندوستان کی طرف سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد بولنے اور جب وہ مائک کے پاس آئے، تو پورا ہال تالیوں کی گونج سے بھر گیا، کارروائی انگریزی میں ہو رہی تھی، مگر انھوں نے بہت ہی فصیح و بلیغ اردو میں مجمع کو مخاطب کیا' اردو میں ان کا بولنا پاکستانی سامعین کو پسند آیا، انھوں نے اس ضرورت پر زور دیا کہ اقبالیات کے اسکالروں کا یہ بین الاقوامی فورم مستقل بنا دیا جائے، تاکہ علامہ اقبال پر ہونے والا کام ایک دوسرے کے تعاون سے بڑھے، اپنی تقریر کے درمیان یہ شعر پڑھا

عشق شور انگیز بر جادہ در کوئے تو برد
بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

پھر ہندوستانی مندوبین کی جو پذیرائی ہوئی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا،

دو دن میں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح
تیرے ہی اختیار میں ہیں عمر بھر سے ہم

تو پورا ہال متاثر ہو کر تالیاں بجا رہا تھا، ان کا اندازِ تخاطب کچھ ایسا تھا کہ جلسہ کے بعد

لوگوں کی زبان پر تھا کہ یہ بہترین تقریر تھی،

امریکہ کی خاتون ڈاکٹر مٹکاف باربرا بھی اردو میں بولیں جس سے شاید ان پاکستانی حضرات نے ضرور سبق لیا ہوگا جو اپنے خیالات کا اظہار اردو کے بجائے انگریزی میں کر رہے تھے، وہ بولیں کہ کانگریس نے دور دراز کے لوگوں کو ایک ساتھ مل کر بیٹھنے کا موقع دیا، تاکہ وہ علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ سے آگاہ ہو سکیں، وہ خود بھی اس سے مستفید ہوئیں، اور لاہور سے یادوں کا خزینہ ساتھ لے کر جا رہی ہیں، فرانس کی مسز سعید یاسین اہل رش نے لاہور اور شالیمار پر انگریزی میں دو نظمیں سنائیں، جو انھوں نے اس کانگریس کے موقع پر کہی تھی، سوڈان کے نمائندہ جسٹس مبارک مغربی نے عربی میں علامہ اقبال کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا، ترکی کے فواد بہرام اوغلو نے اس توقع کا اظہار کیا کہ علامہ اقبال کی فکر کو سمجھنے کے لئے تبادلہ خیال کا جو سلسلہ لاہور کانگریس میں شروع ہوا ہے، وہ جاری رکھا جائے گا، اٹلی کے پروفیسر بوسانی نے کہا کہ علامہ اقبال صرف سائنس کے مطالعہ اور تحقیق و جستجو کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ وہ انسان کو عشق اور روحانیت کی طرف بھی بلاتے ہیں، بلجیم کے نمائندہ پروفیسر اسکال موسکی نے کہا کہ ان کو بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے، لیکن یہاں کی ایسی شاندار اور کامیاب کانگریس کہیں اور نہیں دیکھی،

اس کے بعد جناب جنرل ضیاء الحق مجمع کو مخاطب کرنے کے لئے اٹھے، علامہ اقبال پاکستانیوں کے ذہن و دل پر جس طرح چھائے ہوئے ہیں، اس کی پوری ترجمانی ان کی تقریر میں ہوئی، اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کا پیام آفاقی ہے، جو تمام لوگوں کی رہنمائی ہر وقت اور ہر جگہ کرتا رہے گا، کیونکہ اس شاعرِ مشرق کے یہاں انسان کی عظمت کا درس ہے، بیرونِ دنیا میں ان کی شہرت اُن کے عظیم پیام کی وجہ سے ہے۔ ان کی نظر سمندروں

کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں تک تھی، وہ تسخیر کائنات کا راز جانتے تھے، پھر وہ شخص کو اس کے آئیڈیل کو عملی شکل دینے اور رازہائے حیات کو باہر لانے پر تیار کرتے ہیں، اور اس کے لئے خدا کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیتے ہیں، انھوں نے اپنی تقریر میں پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ اقبالیات قائم کرنے کی بھی ہدایت دی تاکہ اقبالیات پر بامقصد اور موثر تحقیق ہو،

اس موقع پر یہ بھی بتایا گیا کہ اس بین الاقوامی کانگریس میں ۱۹۳ مندوبین نے شرکت کی، جس میں ۷۰ بیرونی ممالک سے آئے، اس میں ۸۰ مقالات پیش کئے گئے، جس میں پچاسی انگریزی، دس عربی اور پینتالیس اردو زبان میں تھے، یہ تقریب ختم ہونے والی تھی کہ جناب جنرل ضیاء الحق نے ایک بار پھر جناب بشیر حسین ناظم سے علامہ اقبال کی کوئی نظم سنانے کی فرمائش کی، وہ اسٹیج پر آئے تو اپنی بہت ہی مترنم اور نغمہ ریز آواز میں یہ نظم شروع کی،

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری | مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اور جب وہ اس شعر پر پہونچے کہ

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں | کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

تو پورے مجمع پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اُن کے پڑھنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا،

اس تقریب کے بعد چائے اور کافی بھی تھی، پھر ہم لوگ ہوٹل واپس ہوئے، ایک بجے کھانا تھا، پھر ڈھائی بجے لاہور کی تاریخی عمارتوں کی سیر کا پروگرام تھا، پہلے ہم لوگ جہانگیر کے مقبرے لے جائے گئے، اس کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا، مگر اس بار دیکھ کر جہانگیر کی دلآویز اور رعنا شخصیت تزک جہانگیری میں اس کی نثر نگاری کی شگفتگی، حکمرانی میں اس کی رواداری اور فراخدلی، علم و فن کی اس کی قدردانی اور سرپرستی نورجہاں سے اس کی شیفتگی، اور پھر نورجہان کی وجہ سے ہندوستان کے تمدن میں انقلاب پذیری کی ساری تصویریں سامنے آگئیں، خیال آیا کہ دہلی اور آگرہ

کے یہ حکمراں اپنے زمانہ میں دنیا میں متمدن ترین اور طاقتور ترین حکومت کے والی سمجھے جاتے تھے، مگر اسی آگرہ اور دہلی کے مسلمان اب کیا سے کیا ہو کر رہ گئے ہیں، جذبات میں یہ تلاطم پیدا ہو رہا تھا کہ ہم لوگوں سے کہا گیا کہ اب یہاں سے لاہور کے قلعے کو دیکھنے کے لئے جانا ہے، وہاں پہنچ کر مجھ کو معلوم ہوا کہ جس اسپتال میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب دل کے مرض میں مبتلا ہو کر آگئے ہیں، وہ قریب ہے، کانگریس کے آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر خواجہ غلام صادق نے ازراہِ کرم ایک موٹر دی، اور جناب بشیر احمد ڈار صاحب بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اسپتال لے گئے، جہاں جناب راشدی صاحب کو خوش اور مطمئن دیکھ کر بڑی راحت ہوئی، قلعہ کی تقریب میں شرکت کرنے سے زیادہ مسرت ان کے پاس بیٹھنے میں ہوئی،

مغرب کے بعد ہوٹل پہنچا تو لاہور کے ٹیلی ویژن اسٹیشن والے ہندوستان کے وفد کو اپنے یہاں انٹرویو کے لئے لے گئے، یہ انٹرویو ایک گھنٹہ کا رہا، ناہید کشور صاحبہ نے ہندوستان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے متعلق بہت سے سوالات کئے، جن سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ یہاں کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں، جناب علی سردار جعفری، اور پروفیسر آل احمد سرور ان کے سوالات کا تشفی بخش جوابات دیتے رہے، پھر انھوں نے علامہ محمد اقبال سے متعلق ہم لوگوں کے تاثرات فرداً فرداً پوچھے، میں نے اپنے تاثرات کے سلسلہ میں بیان کیا کہ ہندوستان میں علامہ محمد اقبال کو واپس لانے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نمایاں حصہ ہے، پھر ان کے متعلق اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ میں کسی حال میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ فرنگی مفکروں کی گاڑی کے قلی تھے، دارالمصنفین کے بارہ میں بھی مجھ سے سوال کیا گیا، میں نے اس ادارہ کو پاکستان کے ندر جس طرح کر دیا گیا ہے اس کی مختصر تفصیل بتائی،

۸- دسمبر کو ہم لوگوں کا پروگرام سیالکوٹ جانے کا تھا، جہاں علامہ محمد اقبال پیدا ہوئے لاہور سے سیالکوٹ کا سفر بس سے تقریباً تین گھنٹے تک تھا، تین بسیں اور پندرہ موٹر گاڑیاں ساتھ چلیں، ایک اچھا خاصہ جلوس ہوگیا، لاہور شہر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ باہر نکلے، پروفیسر میاں محمد سعید کا ذکر پہلے کرچکا ہوں، وہ امریکہ میں جارج مین یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، ہم دونوں ساتھ بیٹھے، وہ راستہ میں ہر علاقہ کی تاریخ بتاتے گئے، ہم لوگ وزیرآباد سے گذرے تو انھوں نے بتایا کہ یہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا وطن ہے، یکایک خیال آیا کہ وہ دارالمصنفین اعظم گڈھ بھی تشریف لائے تھے، شہر میں ان کا جلوس نکالا گیا تھا، تو ان کو ایک فٹن پر بٹھا کر شہریوں نے خود گاڑی کھینچی تھی، وہ یاد آئے تو اُن کا اخبار زمیندار بھی یاد آیا، اور پھر شاعری میں ان کی قادرالکلامی اور پرگوئی ذہن پر چھا گئی، پورا علاقہ بہت شاداب اور زرخیز نظر آیا، میاں محمد سعید صاحب یہاں کی زرخیزی اور شادابی کا ذکر کرتے رہے، راستہ میں اس جلوس کو دیکھنے کے لئے سڑکوں کے دونوں کنارے پر جابجا لوگ کھڑے تھے، خوش ہو کر تالیاں بھی بجاتے، جابجا پھاٹک اور کاغذ کی جھنڈیاں بھی لگا رکھی تھیں، ہم لوگ سیالکوٹ پہونچے تو بوائے اسکاؤٹ کی ایک لمبی قطار استقبال کے لئے کھڑی تھی، بینڈ باجے بھی بج رہے تھے، سیالکوٹ کو وہاں کے شہریوں نے خوب سجایا تھا، ایک بہت بڑے شامیانہ کے نیچے ہم لوگ بٹھائے گئے، جہاں کا اجتماع علامہ اقبال کی بین الاقوامی کانگریس کے ایک جلسہ میں تبدیل ہوگیا، اور اس کو ہونا بھی چاہئے تھا، کیونکہ علامہ اقبال کے مولد کا بھی حق پہنچتا تھا، اس کی صدارت زون اے کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کی، یہاں زیادہ تر زبانی تقریریں ہوئیں، سری لنکا کے پروفیسر کیرد تا رتنے نے علامہ اقبال پر ایک موثر تقریر کی، اور وہاں کی یونیورسٹی میں اقبالیات پر ایک شعبہ کھولنے کی تجویز پیش کی، بنگلہ دیش کی راج شاہی یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد کلیم نے اردو میں بڑی اچھی

تقریر کی، سین ڈی آگو کے ڈاکٹر شبنم دل نے اس موقع پر اپنی بڑی جراتمندانہ تقریر میں پاکستان میں جلد از جلد جمہوریت کی واپسی کے خواہاں ہوئے، پروفیسر میاں محمد سعید نے مجھ سے بھی تقریر کرنے کی فرمایش کی، مگر میں اس کے لئے تیار نہیں ہوا، اسٹیج پر پھر پروفیسر مگن ناتھ آزاد بلائے گئے، وہ تھوڑی دیر تک تو اردو میں بولے، پھر علامہ اقبال پر اپنی ایک نظم سنائی جو انھوں نے اس جشن سے متاثر ہو کر کہی تھی اس کا پہلا بند یہ تھا،

چھلک رہا ہے نگہ سے دل کا پیمانہ — یہی نیاز ہے میری یہی ہے نذرانہ
جو تو سنے تو مرا ہر نفس حقیقت ہو — وگرنہ میرا سخن بھی فسون و افسانہ
تری نوا کہ زمانہ کا درد ہے اس میں — یہی حرم ہو مرا اور یہی ہے بتخانہ
سلام رومیٔ عصر جدید تجھ پہ سلام — سلام محرم راز درون میخانہ

جدید دور میں تیرے سوا کوئی نہ نکلا
نظر ہو جس کی حکیمانہ بات رندانہ

آخری بند یہ تھا،

میں آرہا ہوں دیارِ مزارِ غالب سے — ترے مزار پہ لایا ہوں دل کا نذرانہ
مری خموش نگاہی مری خموشی نطق — اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ
ضیائے طور معانی بس اک لطیف جھلک — کہ مضطرب ہے مرا جذبہ حکیمانہ
اک ارمغاں تجھے لفظوں میں پیش کرتا ہوں — گرچہ مرا ہر آنسو ہے دریک دانہ
اس ارمغانِ محبت کی ہو پذیرائی — کہ آج محفل احباب میں ہوں بیگانہ

چلا تھا گھر سے جو کل تیری آرزو لے کر
مقامِ شوق میں گم ہوگیا وہ فرزانہ

ظاہر ہے کہ اس نظم کی داد کیسے نہ ملتی، آزاد کی پذیرائی ہر جگہ ہو رہی تھی، اس نظم کے بعد وہ اور بھی مقبول ہوئے، اُن کے قدردانوں اور دوستوں کا جمگھٹا برابر اُن کے اِرد گرد رہا، یہاں پروفیسر آل احمد سرور نہ آسکے تھے، کیونکہ اُن کی طبیعت خراب ہوگئی تھی، جناب علی سردار جعفری آئے تھے، جناب فیض احمد فیض صاحب سے اُن کے گہرے تعلقات ہیں، اس لئے وہ ہر جگہ ان ہی کے ساتھ دکھائی دیئے،

اس جلسہ کے بعد ہم لوگ جلوس کی شکل میں پاپیادہ اقبال منزل کی طرف چلے، اتفاق سے جلوس کے آگے آگے ہم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور سری لنکا کے نمایندے تھے، اقبال منزل پہنچنے کے لئے جن سڑکوں اور گلیوں سے ہم لوگ گذرے، وہ جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھیں، کوٹھوں اور چھتوں پر لوگ کھڑے جلوس کو دیکھ رہے تھے، اور بکثرت پھول نچھاور کر رہے تھے، ایک جگہ ایک تاجر صاحب تین قیمتی ہار لئے کھڑے تھے، ہم تین آدمی جو آگے آگے تھے انھوں نے ہمارے ہی گلوں میں یہ تینوں ہار ڈال دئے، ہم بھی پہلے اقبال منزل پہونچے، جو ہر طرح صاف ستھری دکھائی دی، اس کے مختلف کمرے دکھائے گئے، اور اب وہاں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم کردی گئی ہے، سیالکوٹ کے لوگوں نے جس مسرت، اخلاص اور بلند حوصلگی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا، اس سے تمام مندوبین متاثر تھے،

وہاں کی مروسنز کلب میں ایک پرتکلف لنچ رکھا گیا تھا، جس میں حسب معمول طرح طرح کے کھانے اور پھل تھے، لنچ کے بعد علامہ اقبال کے استاد جناب مولوی سید میر حسن کی پوتی مس کاظمی، پرنسپل زنانہ گورنمنٹ کالج سیالکوٹ نے تمام مندوبین کو یادگار کے طور پر اقبال کے شاہین کا ایک تحفہ پیش کیا، جو غالباً جست کا بنا ہوا ہے، اس کے بعد دس بین الاقوامی کانگریس کی باضابطہ کارروائیاں ختم ہوگئیں، اور ہم لوگ لاہور اپنے ہوٹل میں واپس آئے

(باقی)

ادبیات

صبح انسانیت

از جناب ماہر القادری صاحب (کراچی)

یہ جہانِ آب و گل مدت سے تاریکی میں تھا
تھی مسلط ہر طرف ظلم و جہالت کی گھٹا

کاروانِ زندگی، بہکا ہوا، بھٹکا ہوا
سارا عالم ایک سکتہ، ساری دنیا اک خلا

اہلِ دانش بھی فریبِ جہل میں آئے ہوئے
بے یقینی کے اندھیرے ذہن پر چھائے ہوئے

خود تراشیدہ بتوں کے سامنے جھکتے تھے سر
آدمی دنیا میں رہ کر اپنے رب سے بے خبر

لوگ اپنی خواہشوں پر صرف رکھتے تھے نظر
رفتہ رفتہ مٹ گیا تھا امتیازِ خیر و شر

راہبر بھی راستوں کے پیچ و خم میں کھو گئے
دیکھتے ہی دیکھتے انسان، حیوان ہوگئے

ہر طرف برپا فساد و انتشار و اضطراب
ایسے عالم میں ضروری تھا کہ آئے انقلاب

یک بہ یک اُبھرا حرا کے غار سے اک آفتاب
وہ محمدؐ مصطفےٰ، اُمّی لقبؐ رحمت مآبؐ

اُس کا آنا تھا کہ جنت کے دریچے کھُل گئے
ابرِ رحمت اس قدر برسا کہ چہرے دھُل گئے

قائدِ لشکر بھی ہے، جو صاحبِ منبر بھی ہے
شافعِ محشر بھی ہے اور ساقیٔ کوثر بھی ہے

جس کی سیرت کا ورق طائف بھی ہے خیبر بھی ہے
جو ظہورِ حق بھی ہے، مَظہر بھی ہے، مُظہر بھی ہے

جس کا احسان اور کرم انسانیت پر قرض ہے
وہ بشر، خیر البشرؐ جس کی اطاعت فرض ہے

جس نے انساں کو طریقے زیست کے سمجھا دیئے
دین و دنیا میں توازن کے لیے کیا چاہیے

جس نے بخشے زندگی کو حوصلے اور ولولے
وہ نظر صلِ علیٰ ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے

جس نے تہذیب و تمدن کو مودب کر دیا
وحشیوں، صحرا نشینوں کو مہذب کر دیا

ذوق کو پاکیزگی، وجدان کو تقدیس دی
ذہن کو تابندگی، فکر و نظر کو روشنی

خواجگی و سروری میں بھی وہ فقر و سادگی
جس کے آگے سرخمیدہ سطوتِ شاہنشہی

دل کے دھندلے آئینوں کو بھی مجلا کر دیا
جھونپڑوں کو رشکِ قصر معلیٰ کر دیا

صنفِ نازک کو بتائے شرم و غیرت کے حدود
عصمتِ زن کی حفاظت کو ضروری تھیں قیود

زندگی دلکش بنادی ان حدود کے باوجود
احمدؐ و حامدؐ محمدؐ مصطفیٰ پر ہو درود

آپ کا قول و عمل تفسیر ہے قرآن کی
اتباعِ مصطفیٰ معراج ہے انسان کی

الصلوٰۃ والسلام اے رحمۃ للعلمینؐ
السلام اے النبیؐ والرسولؐ والامینؐ

السلام اے پیشوا اے اولین و آخرین
آپ ہی کا سب تصدق ہے وہ دنیا ہو کہ دین

نعت گوئی میرا منصب ہے نہ میں حسانؓ ہوں
میرے آنسو شعر بن جائیں تو پھر میں کیا کروں،

فخرِ ہر پیدا و پنہاں رحمۃ للعالمین

(از: پروفیسر شاہ سید معین الدین حسن، خادم حضرت خواجہ غریب نوازؒ، اجمیر شریف)

خلقِ تو، تفسیرِ قرآں، رحمۃ للعالمین
روئے تو، تصویرِ ایماں رحمۃ للعالمیں

ہر ادا، جنت بداماں ہر سخن فردوس گوش
ہر نظر صبحِ بہاراں رحمۃ للعالمیں

ہر نفس، سرگرمِ تبلیغِ فلاحِ روزگار
ہر عمل رحمت بداماں رحمۃ للعالمیں

نورِ اول، سیدِ کل، مقصدِ کون و مکاں
فخرِ ہر پیدا و پنہاں رحمۃ للعالمیں

کیمیا سازِ سعادت ہو گئی تیری ولا
مل گئی اکسیرِ ایماں رحمۃ للعالمیں

بادہ آشامِ محبت کے لیے تیرا جمال
ہو گیا صہبائے عرفاں رحمۃ للعالمیں

یوسفِ مصرِ محبت، شہریارِ رنگ و بو
فیض بخشِ سائلِ ایماں رحمۃ للعالمیں

خلق کہتی ہی نہیں "حضرت محمد مصطفیٰ"
برملا کہتا ہے "رحماں" رحمۃ للعالمیں

خوش نصیبی طالعِ حقہ کی میرے دیکھئے
ہو گئے ہیں دل میں مہماں رحمۃ للعالمیں

اے ضیا پاشِ محبت، اے نگارِ دین و دل
میرا سب کچھ تجھ پہ قرباں رحمۃ للعالمیں

افتخارِ فقر و شاہی، محسنِ دنیا و دیں
شاہکارِ دستِ یزداں رحمۃ للعالمیں

اے نبی و شانِ محشر را شفیعِ کامگار
اے مجسم خیر و احساں، رحمۃ للعالمیں

گوہرِ یکتائے دیں کے وصف سے عاجز حسنؔ
کیوں نہ ہو سر در گریباں رحمۃ للعالمیں

اے نگارِ ہر دو عالم تیری الفت میں حسنؔ!
نعت گو ہے مثلِ سحباں رحمۃ للعالمیں

مطبوعاتِ جدیدہ

ابوالکلام آزاد احوال و آثار

مرتبہ جناب مسعود الحسن عثمانی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۲۴ مجلد مع گرد پوش قیمت پندرہ روپے، پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

۷۶ء میں مولانا ابوالکلام کے افکار و نظریات کی اشاعت کے لئے لکھنؤ میں مولانا آزاد میموریل اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا، یہ کتاب اس کی پہلی پیشکش اور مولانا کی بوقلموں شخصیت کے متعلق بارہ مضامین کا خوشنما گلدستہ ہے، اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین، سعید انصاری، قاضی عدیل عباسی، دارالمصنفین کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمن، شریک ناظم مولانا عبدالسلام قدوائی، اور ابوالکلامیات کے ماہر مالک رام جیسے نامور ارباب علم کے مضامین بھی ہیں، اور مولانا کے پرستاروں میں ابوسلمان شاہجہاں پوری، ریاض الرحمن شروانی، محمد شعیب عمری یونس خالدی، اور مولانا کے سیاسی رفیق آنجہانی پنڈت جواہرلال نہرو کی نگارشات بھی ہیں ڈاکٹر سید عابد حسین کے مضمون میں مولانا کے ادبی مرتبہ کو واضح کیا گیا ہے، سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے الہلال کی گرج اور کڑک کا ذکر کرکے جنگ آزادی میں اس کا حصہ دکھایا ہے، قاضی عدیل عباسی صاحب نے مولانا کے بعض نامور معاصرین کے مقابلہ میں انکی عظمت و برتری دکھائی ہے، مرتب نے مولانا شبلی سے مولانا کے ذوق و طبیعت کی مناسبت ذہنی ہم آہنگی اور فکری اتحاد کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ ان مضامین سے

مولانا کے فضل و کمال، ذہانت و عبقریت، فراست و تدبر، فکر و اجتہاد، علمی، ادبی، سیاسی اور دینی عظمت اور متنوع وہمہ گیر شخصیت کے خط وخال اچھی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں، مولانا کے متعلق متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، یہ اس ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہے، اگر اس میں مولانا کے عام حالات سوانح اور ۴۷ء کے بعد کی زندگی کے متعلق بھی جب وہ جمہوریہ ہند کے وزیر تعلیم تھے، ایک ایک مضمون شامل ہو جاتا تو اس کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی، مالک رام صاحب نے مولانا کی صحافت کے ذکر میں جملہ معترضہ کے طور پر بعض غیر متعلق باتیں تو لکھی ہیں، لیکن مولانا کی ادارت میں دوبارہ شائع ہونے والے الہلال کا ذکر نہیں کیا ہے، انھوں نے البلاغ کے سلسلہ میں مولانا کے بنگال سے اخراج کے ضمن میں لکھا ہے "چونکہ بیشتر دوسرے صوبوں کی حکومتیں اپنے ہاں ان کا داخلہ پہلے سے ممنوع قرار دے چکی تھیں، اب صرف بہار اور بمبئی ہی ایسے دو صوبے تھے جہاں وہ جاسکتے تھے" (صفحہ ۴۵) لیکن بمبئی کے بارہ میں اس صراحت کی تردید خود مولانا نے انڈیا ونس فریڈم میں کی ہے، جسکو سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے "پنجاب، دہلی، یوپی، اور بمبئی کی حکومتوں نے مجھے اپنے حدود میں اندر داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی" (صفحہ ۹۲) سعید انصاری صاحب نے لکھا ہے "۱۹۲۰ء سے لے کر ان کی وفات تک کوئی ۵۰ سال ہوتے ہیں" (ص ۶۹) حالانکہ ۳۸ سال ہی ہوتے ہیں، کیونکہ مولانا کی وفات ۵۸ء میں ہوئی تھی، مرتب نے تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کے متعلق مولانا شبلی کے خیالات کو خلط ملط کر دیا ہے، وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے مگر آزادی نسواں کے سلسلے میں بے پردگی کے حامی نہ تھے، خود مرتب بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکے ہیں، اسی طرح علم موسیقی سے مولانا شبلی کی واقفیت کو اس کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ اس کو جائز بھی سمجھتے تھے، ایک جگہ انھوں نے ندوہ سے مولانا آزاد کے جانے کا ذکر اسطرح کیا ہے "اس کی بند فضا انھیں راس نہیں آسکتی تھی" (ص ۲۱۳) لیکن دوسری جگہ اسکے برعکس یہ لکھا ہے "لکھنؤ کے اس قیام اور علامہ شبلی کی رفاقت کو مولانا آزاد کبھی بھول نہیں سکے"

(ص ۲۱۵) اور اس کے ثبوت میں خود مولانا کی بھی ایک تحریر نقل کی ہے کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، جیسے حلب آزادی (ص ۵۶) بجائے سلب دور متوسلین (ص ۹۵) بجائے متوسطین، خالص معروضی مطالبہ (ص ۱۷۰) بجائے مطالعہ، مالہ وما الیہ (ص ۲۰۰) بجائے ماعلیہ، نامکمل سیاست (ص ۲۰۳) بجائے سیاحت اور صحبۃ الاسلام امام محمد غزالی (ص ۲۰۴) بجائے حجۃ الاسلام وغیرہ،

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت:-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت۔	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	″ ″ ″
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
ایڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمٰن، عبد السلام قدوائی ندوی
قومیت	ہندوستانی،
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	″ ″ ″

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔"

سید اقبال احمد

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۸ء عدد ۴

مضامین

شذرات

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد